مسلسل اشاعت کے 60 سال

ذُوالحجہ ۱۴۴۷ھ
مئی ۲۰۲۶ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- حقیقتِ ایمان از ڈاکٹر اسرار اَحمدؒ
- بیسویں صدی کا ایک عظیم داعیٔ قرآن
- صہیونیت اور ہندوتوا: ایک ہی سکّے کے دو رُخ
- اُمّتِ مسلمہ: اِتحاد ہی میں بقا!
- مسلم دُنیا کی وحدت
- حرفِ بدرا برلب آوردن خطاست!

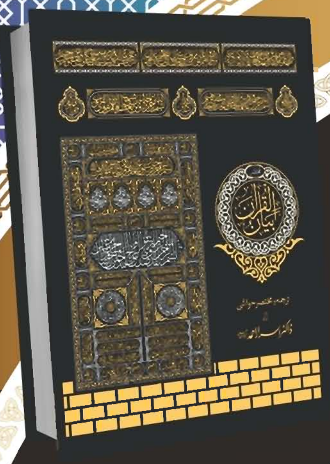

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت
کے بعد اب پیش ہے:

مختصر
بیانُ القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

- مضبوط جلد
- دیدہ زیب ٹائٹل
- 1248 صفحات

- ڈیلکس ایڈیشن: ~~4500~~ کے بجائے 2200 روپے
- سٹینڈرڈ ایڈیشن: ~~2500~~ کے بجائے 1500 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org
0301-1115348

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ: ۷)

”اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!“

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

جلد : 75
شمارہ : 5
ذوالحجہ 1447ھ
مئی 2026ء
فی شمارہ : 60 روپے
سالانہ زرِ تعاون : 600 روپے

مُدیر مسئول
شجاع الدّین شیخ

مُدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلسِ ادارت
رضاء الحق ● ایوب بیگ مرزا
● خورشید انجم ● وسیم احمد

معاون مدیران
● محمد خلیق ● حافظ محمد زاہد

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور، K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
فون: 3-35869501 (042) ، 0341-4941212
ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ”دارالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ____ 5

اُمّتِ مسلمہ: اتحاد ہی میں بقا!

رضاء الحق

تذکرہ و تبصرہ ____ 8

مسلم دُنیا کی وحدت

شجاع الدین شیخ

ابوظبی سیریز ____ 11

حقیقتِ ایمان

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

درسِ قرآن ____ 37

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۷)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

رفتید ولے نہ از دلِ ما ____ 62

بیسویں صدی کا ایک عظیم داعیٔ قرآن

حافظ طاہر عبداللہ صدیقی، ناصر الدین

ظروف و احوال ____ 85

حرفِ بدرا برلب آوردن خطاست!

ایوب بیگ مرزا

دعوت فکر ____ 93

صہیونیت اور ہندوتوا:

ایک ہی سکّے کے دو رُخ

رانا عرفان علی

”ادارہ“ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُمّتِ مُسلمہ: اِتّحاد ہی میں بقا!

عالمی منظرنامہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ طاقت کے مراکز اپنی صف بندیوں میں مصروف ہیں‘ اور دنیا ایک بار پھر ایسے دوراہے پر کھڑی دکھائی دیتی ہے جہاں جنگ اور امن کے درمیان فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں بڑھتی ہوئی کشیدگی‘ عالمی طاقتوں کی چپقلش‘ اور اسرائیلی جارحیت نے حالات کو اِس نہج پر پہنچا دیا ہے کہ کسی بھی لمحے ایک بڑی آگ بھڑک سکتی ہے۔ بظاہر امن کی باتیں کی جا رہی ہیں‘ مگر عملی طور پر طاقت کا کھیل پوری شدت سے جاری ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب دنیا امن کی جانب بڑھ رہی ہے تو کشیدگی کیوں کم نہیں ہو رہی؟ اس کا جواب واشنگٹن کی پالیسیوں میں پوشیدہ ہے۔ آبنائے ہرمز کی ناکا بندی جیسے اقدامات اور مسلسل دھمکی آمیز لہجہ اس تاثر کو مضبوط کرتے ہیں کہ امریکہ بیک وقت دو کھیل کھیل رہا ہے: ایک طرف مذاکرات کی فضا قائم کرنا‘ اور دوسری طرف دباؤ اور خوف کے ذریعے اپنی بالادستی برقرار رکھنا۔

امریکی صدر کے سیاسی بیانات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اُن کی تمام تر توجہ محض اِس بات پر ہے کہ کسی طرح سے امن کا نوبل انعام اُنہیں مل جائے۔ اِس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ امن کو پہلے جنگ میں بدلتے ہیں‘ پھر امن اور صلح کا پیغام لے کر آ جاتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ دنیا اب اِس طرزِ سیاست کو سمجھنے لگی ہے۔ چین‘ روس‘ برطانیہ‘ سپین اور ترکیہ جیسے ممالک کی جانب سے آبنائے ہرمز کی ناکا بندی جیسے اقدامات سے فاصلہ اختیار کرنا اِسی شعور کی عکاسی ہے۔ اٹلی کی جانب سے اسرائیل کے ساتھ دفاعی معاہدہ معطل کرنا‘ اور خود امریکہ کے اندر عوامی احتجاج کا ابھرنا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ عالمی ضمیر اب جاگ رہا ہے۔ حتیٰ کہ مذہبی حلقے بھی خاموش نہیں رہے۔ پوپ لیو کی جانب سے جنگی پالیسیوں پر تنقید نے اس بحران کو ایک اخلاقی مسئلے کے طور پر بھی اجاگر کر دیا ہے۔ برطانوی وزیر خزانہ کا کہنا ہے کہ ایران کے ساتھ مذاکرات کا خاتمہ اور فوجی تصادم کا آغاز امریکہ کی ایک غلطی ہے۔ عالمی بینک کے چیف اکانومسٹ نے

خبردار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایران امریکہ جنگ کے نتیجے میں کروڑوں انسان بھوک کا شکار ہو سکتے ہیں۔ جبکہ پہلے ہی دنیا میں بیس کروڑ افراد غذائی عدمِ تحفظ کا شکار ہیں اور حالیہ جنگ ان کی تعداد میں بیس فیصد تک اضافہ کر سکتی ہے۔ اس سب کے باوجود صدر ٹرمپ کا جارحانہ ردِّعمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اختلافِ رائے کو سننے کے بجائے اپنی پالیسی مسلط کرنے کے عادی ہیں۔

اس تناظر میں پاکستان کا کردار خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ایک ایٹمی قوت ہونے کے ساتھ پاکستان کو جغرافیائی اور سفارتی لحاظ سے بھی ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اگر وہ خلوصِ نیت کے ساتھ مسلم دنیا کے درمیان پل کا کردار ادا کرے‘ ایران اور سعودی عرب جیسے اہم ممالک کے درمیان توازن قائم کرے‘ بیک ڈور ڈپلومیسی کے ذریعے ہم آہنگی پیدا کرے تو یہ بڑی پیش رفت ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ پرنٹ‘ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے ذریعے پھیلائے جانے والے منفی پروپیگنڈے کا مؤثر جواب دیا جائے۔ آج کی جنگ صرف سرحدوں پر نہیں بلکہ ذہنوں میں بھی لڑی جا رہی ہے۔ اس لیے فکری بیداری اور نظریاتی استحکام بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے عسکری اقدامات۔

اس نازک صورتِ حال میں اہم ترین اور سب سے زیادہ تشویش ناک پہلو عالمِ اسلام کی داخلی کیفیت ہے۔ ایک طرف بیرونی خطرات منڈلا رہے ہیں تو دوسری طرف مسلم دنیا انتشار‘ باہمی بداعتمادی اور فرقہ وارانہ تقسیم کا شکار ہے۔ کہیں شیعہ سُنّی اختلافات کو ہوا دی جا رہی ہے‘ کہیں قومیت اور علاقائیت کو اسلام کی وحدت پر ترجیح دی جا رہی ہے‘ کہیں ذاتی و حکومتی مفادات اُمّت کے اجتماعی مفاد پر غالب آ چکے ہیں۔ نتیجتاً وہ اُمّت‘ جسے ایک جسم کی مانند قرار دیا گیا تھا‘ آج بکھری ہوئی اکائیوں کا مجموعہ بن چکی ہے۔

تاریخ اِس حقیقت کی گواہ ہے کہ جب بھی مسلمان متحد ہوئے‘ اُنہوں نے ناقابلِ تسخیر قوت کا مظاہرہ کیا۔ خلافتِ راشدہ کا دور ہو یا صلاح الدین ایوبیؒ کا زمانہ‘ اتحاد نے ہی نہ صرف دشمن کو پسپا کیا بلکہ عدل و انصاف کا ایسا نظام قائم کیا جس کی مثال آج بھی دی جاتی ہے۔ اِس کے برعکس جب بھی انتشار نے جنم لیا‘ زوال مقدر بن گیا۔ سقوطِ بغداد سے اُندلس کے المیے تک‘ ہر جگہ تفرقہ ہی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ آج کے حالات اِس سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں ہیں۔ بیرونی طاقتیں مسلم دنیا کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں‘ اور اس مقصد کے لیے سب سے مؤثر ہتھیار ”تقسیم کرو اور حکومت کرو“ ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں جنگوں کو ہوا دی

جا رہی ہے‘ کہیں اقتصادی دباؤ بڑھایا جا رہا ہے‘ کہیں فکری یلغار کے ذریعے نئی نسل کو اپنی جڑوں سے کاٹا جا رہا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی چیز اِس پوری صورتِ حال کا توڑ بن سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف اتحادِ اُمّت ہے۔

اتحاد اب کوئی جذباتی نعرہ نہیں رہا‘ بلکہ ایک عملی ضرورت اور بقا کا تقاضا بن چکا ہے۔ سیاسی سطح پر مشترکہ حکمتِ عملی‘ معاشی میدان میں باہمی تعاون‘ دفاعی شعبے میں اشتراکِ عمل وہ اقدامات ہیں جو مسلم دنیا کو ایک مضبوط بلاک میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ’’او آئی سی‘‘ جیسے پلیٹ فارمز کو محض رسمی ادارے کے بجائے فعال اور مؤثر فورم بنانا ہوگا۔ قیادت کو وقتی مفادات سے بالاتر ہو کر اجتماعی سوچ اپنانا ہوگی۔

اس تمام صورتِ حال میں پاکستان اپنے ’’سافٹ امیج‘‘ کو بہتر بنانے میں کامیابی حاصل کر چکا ہے جو ماضی میں دہشت گردی اور عدم استحکام کے تناظر میں متاثر ہوئی تھی۔ اس بات کا رنج پڑوسی ملک بھارت کے علاوہ اسرائیل کو بھی ہے‘ جس کا اظہار وہاں کے میڈیا سے مسلسل ہو رہا ہے۔ یہاں ایک اہم پہلو اسرائیل کی پالیسی بھی ہے‘ جو خطے میں کشیدگی کو برقرار رکھنے میں اپنا مفاد دیکھتا ہے۔ لبنان پر مسلسل حملے اور ایران کے ساتھ کسی بھی مفاہمت کی مخالفت اسی حکمتِ عملی کا حصہ ہیں کہ ایسا ماحول قائم رکھا جائے جہاں جنگ کا خطرہ مسلسل موجود رہے اور خطہ عدم استحکام کا شکار رہے۔

بھارت کے مسلسل پاکستان مخالف پراپیگنڈے کو رد کرتے ہوئے اب دنیا پاکستان کو ایک ذِمّہ دار‘ سنجیدہ اور امن پسند ریاست کے طور پر دیکھ رہی ہے‘ جو عالمی مسائل کے حل میں مثبت کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایران اور امریکہ کے درمیان ثالثی میں پاکستان کا کردار ایک تاریخی سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے‘ جس نے نہ صرف کسی ممکنہ بحران کو ٹالا بلکہ پاکستان کو عالمی سفارت کاری میں نئی پہچان بھی عطا کی۔ اب ضرورت اِس امر کی ہے کہ اس کامیابی کو وقتی نہ سمجھا جائے بلکہ ایک مستقل پالیسی کا حصہ بنایا جائے‘ تاکہ پاکستان مستقبل میں بھی اسی طرح عالمی امن‘ استحکام اور تعاون کے لیے اپنا کردار ادا کرتا رہے اور دنیا میں ایک مثبت اور تعمیری قوت کے طور پر اپنی جگہ مزید مستحکم کرے۔ ایسے میں دنیا بھر کے مسلم ممالک‘ خصوصاً عرب ممالک کو یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیے کہ حقیقت میں اُن کا دوست کون ہے اور دشمن کون! (باقی صفحہ 10 پر)

مسلم دنیا کی وحدت

شجاع الدین شیخ

ایران اور امریکہ کے درمیان جاری کشیدگی کوئی نئی بات نہیں‘ مگر حالیہ جنگ نے اس تنازع کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ ایران کی جانب سے پاکستان کے ذریعے جنگ بندی اور مذاکرات کے لیے تجاویز پیش کرنا بظاہر معمولی سفارتی قدم ہو سکتا ہے‘ لیکن حقیقت میں یہ ایک بڑی تبدیلی کا اشارہ ہے۔ یہ اس بات کا اعتراف بھی ہے کہ تہران دباؤ کے تحت نہیں بلکہ برابری کی سطح پر بات چیت کا خواہاں ہے اور اس کے لیے وہ اسلام آباد پر اعتماد کرتا ہے۔ پاکستان کی جانب سے میزبانی کی پیشکش اور دونوں فریقین کے ساتھ بیک وقت رابطے اس بات کو مزید تقویت دیتے ہیں کہ وہ اِس بحران میں ’’پُل‘‘ کا کردار ادا کر رہا ہے۔

یہ کردار محض رسمی نہیں بلکہ عملی بھی ہے۔ دنیا کے تقریباً بیس فیصد تیل کی ترسیل کے راستے ’’آبنائے ہرمز‘‘ سے دوست اور غیر دشمن جہازوں کو گزرنے کی مشروط اجازت دینا‘ ایران کی جانب سے عالمی برادری کو دیا جانے والا واضح پیغام ہے کہ وہ اپنی تزویراتی (strategic) پوزیشن کو نہ صرف دفاعی بلکہ سفارتی ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس تنازع کے اثرات مشرقِ وسطیٰ کی حدود سے نکل کر عالمی منڈیوں‘ توانائی کی قیمتوں اور اقتصادی استحکام تک پھیلتے دکھائی دے رہے ہیں۔ دوسری جانب عسکری میدان کا جائزہ لیا جائے تو واضح تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف امریکی بیانیہ ایران کو کمزور اور پسپا دکھا رہا ہے‘ جبکہ زمینی حقائق کچھ اس طرح سے ہیں کہ ایرانی مزاحمت نہ صرف برقرار ہے بلکہ بعض حوالوں سے مؤثر بھی دکھائی دیتی ہے۔ ایرانی میزائلوں کی رسائی‘ اُس کی دفاعی حکمتِ عملی اور قیادت پر حملوں کے باوجود نظام کا فعال رہنا اِس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ جنگ محض طاقت کے بل پر جیتنا آسان نہیں ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یہ تنازع ’’کثیر الجہتی جنگ‘‘ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک سطح پر یہ جنگ میزائلوں اور ڈرونز کے ذریعے لڑی جا رہی ہے تو دوسری سطح پر میڈیا کے ذریعے

بیانیے تشکیل دیے جا رہے ہیں۔ تیسری سطح پر سفارت کاری کے پردے میں خاموش مذاکرات بھی جاری ہیں اور چوتھی سطح پر معیشت کے ذریعے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ اس پیچیدہ صورتِ حال میں کسی ایک فریق کی واضح فتح کا تصور فی الحال حقیقت سے زیادہ خواہش معلوم ہوتا ہے۔

عالمی سطح پر بھی اس جنگ کے اثرات نمایاں ہو رہے ہیں۔ نیٹو کے اندر پائے جانے والے اختلافات، یورپی ممالک کی محتاط پالیسی اور روس و چین کی خاموش یا محدود حمایت اِس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ دنیا نئی صف بندی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ امریکہ کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہو رہا ہے کہ عالمی قیادت صرف عسکری طاقت سے قائم نہیں رہ سکتی بلکہ اس کے لیے اعتماد اور شراکت داری بھی ضروری ہے، اور یہی عناصر تیزی سے کم ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اِس تمام تر صورتِ حال میں افسوس ناک ترین پہلو اقوامِ متحدہ کی بے بسی ہے۔ جب عالمی امن کا ضامن ادارہ محض اپیلوں اور بیانات تک محدود ہو جائے تو اس کی افادیت پر سوال اُٹھنا فطری امر ہے۔ سیکرٹری جنرل کی جانب سے جنگ ختم کرنے کی اپیل دراصل اِس حقیقت کا اعتراف ہے کہ عالمی نظام اپنے بنیادی مقصد یعنی تنازعات کے بروقت حل پیش کرنے میں ناکام ہو رہا ہے۔ تاہم اس بحران کا ایک نہایت اہم پہلو مسلم دنیا کی داخلی کیفیت ہے۔ طاغوتی قوتیں اپنے اختلافات کے باوجود مشترکہ حکمت عملی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مسلم ممالک کے پاس نہ افرادی قوت کی کمی ہے اور نہ ہی اسلحہ و ٹیکنالوجی کی، لیکن اِس کے باوجود وہ آپس کی ناچاکی کا شکار ہیں جبکہ دشمن متحد ہے۔ پھر یہ کہ مسلم ممالک میں سے اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے خام تیل و زرعی پیداوار سمیت بے تحاشا قدرتی وسائل سے نوازا ہے تو کسی کو بہترین فوج، ایٹمی صلاحیت اور میزائل ٹیکنالوجی عطا کی ہے۔ عسکری صلاحیت کے جدید ترین ہتھیار مثلاً ڈرون، جامرز، دفاعی شیلڈز، سیٹلائٹ ٹارگٹنگ کے نظام اور سائبر جنگ کے وسائل بھی اللہ تعالیٰ نے مسلم ممالک کو چھپر پھاڑ کر دیے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج مسلمان انتہائی پستی کے عالم میں ہیں اور تتر بتر دکھائی دیتے ہیں جبکہ طاغوتی قوتیں ایک ایک کر کے سب کو شکار کر رہی ہیں۔

مسلمانوں کے ازلی دشمنوں یعنی اسرائیل، امریکہ اور بھارت پر مشتمل ابلیسی اتحادِ ثلاثہ جب کسی ایک مسلم ملک پر حملہ کرتا ہے تو کوئی مسلم ممالک مظلوم کی مدد کرنے کی بجائے حملہ آوروں کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں، جس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ طاغوتی قوتوں کے فوجی اڈے اُن

مسلم ممالک کی سرزمین پر موجود ہیں۔ درحقیقت اِس وقت مسلم ممالک ''وَہن'' کی اُس بیماری کا شکار دکھائی دیتے ہیں، جس کی تشخیص کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے چودہ سو سال قبل فرما دیا تھا کہ یہ ذلت و رسوائی دنیا کی محبت اور موت سے خوف کے باعث ہوگی۔ مسلم ممالک کے چھوٹے چھوٹے ذاتی اور مادی مفادات کے حصول کی تگ و دو کا دشمن فائدہ اُٹھا رہا ہے۔

درحقیقت جب تک مسلم دنیا اپنے اندرونی اختلافات کو ختم کر کے ایک مشترکہ لائحہ عمل اختیار نہیں کرتی، اُس وقت تک وہ عالمی سطح پر مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ منتشر قوتیں ہمیشہ منظم قوتوں کے سامنے کمزور پڑ جاتی ہیں، چاہے اُن کے پاس وسائل کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ اگر آج بھی مسلم ممالک قرآن و سُنّت کی طرف لوٹ آئیں، اپنے اصل دشمنوں کو پہچان کر آپس کی لڑائیاں ختم کریں اور متحد ہو کر طاغوتی قوتوں کو للکاریں تو اللہ تعالیٰ کی مدد اُن کے شاملِ حال ہو گی۔ اسی صورت میں باطل قوتوں کے مذموم مقاصد کو بھی ناکام بنایا جا سکے گا اور ایک بڑے مقصد کے حصول کی خاطر علاقائی و مسلکی انتشار بھی پس پشت چلا جائے گا، جس سے اسلام کا بول بالا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ مسلم ممالک کے حکمرانوں، ریاستی اداروں اور عوام کو ہدایت عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

بقیہ: عرضِ احوال

عالمِ اسلام نے اگر اب بھی اپنی ترجیحات درست نہ کیں، اپنے اختلافات کو ختم نہ کیا، مشترکہ لائحہ عمل اختیار نہ کیا اور ''نیٹو'' کی طرز کا فوجی اتحاد قائم نہ کیا تو آنے والا وقت مزید آزمائشوں کا پیغام لے کر آ سکتا ہے۔ اگر بصیرت، حکمت اور اخلاص کے ساتھ اتحاد کی راہ اختیار کی جائے تو یہی بحران نئے عروج کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے۔ وقت کا تقاضا واضح ہے کہ یا تو اُمت متحد ہو کر اپنے مستقبل کا تعین خود کرے، یا پھر تقسیم در تقسیم کا شکار ہو کر دوسروں کے فیصلوں کی تابع بن جائے۔ انتخاب بے شک ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ رع: ''فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم!'' اللہ تعالیٰ عالمِ اسلام کے سربراہان کو صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

حقیقتِ ایمان

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ —— بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸۵﴾﴾ (البقرۃ)

﴿فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾ (الانعام)

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ﴿۷﴾﴾ (الحجرات)

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

(الحجرات)

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ○ وَ یَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ○ اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنَا رُشْدَنَا وَ اَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا، اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ اِلَیْنَا الْاِیْمَانَ وَزَیِّنْهُ فِیْ قُلُوْبِنَا وَ كَرِّهْ اِلَیْنَا الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْیَانَ، وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِیْنَ۔ آمِیْن یَا رَب الْعَالَمِیْن!!

آج دین کے انتہائی اہم اور سب سے زیادہ بنیادی موضوع پر گفتگو کی جائے گی۔ ہمارے دین کا اہم ترین لفظ ''ایمان'' ہے لیکن اکثر و بیشتر پڑھے لکھے لوگ بھی اس لفظ

کے اصل معنی سے ناواقف ہیں۔ بعض الفاظ کو ہم کثرت سے استعمال کرتے ہیں لیکن کبھی غور ہی نہیں کرتے کہ اس کے معنی کیا ہیں! آج ایمان کے بارے میں بنیادی حقائق ہمارے سامنے آئیں گے۔ یہ گویا ''کتاب الایمان'' کا ایک مطالعہ ہے جو کہ دس ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) ایمان کے لُغوی معنی	(۲) ایمان کے اصطلاحی معنی
(۳) ایمان کا موضوع	(۴) ایمانیاتِ ثلاثہ کی تفصیل
(۵) ایمانیاتِ ثلاثہ کی تقابلی اہمیت	(۶) ایمان کے دو درجے
(۷) ایمان اور عمل کا تعلق	(۸) ایمان اور جہاد کا تعلق
(۹) ایمان اور امن کا تعلق	(۱۰) ایمانِ حقیقی کے حصول کے ذرائع

۱) ایمان کے لُغوی معنی

قرآن حکیم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام ہے لیکن یہ ایک انسانی زبان یعنی عربی میں نازل ہوا جو کہ پہلے سے موجود تھی‘ جیسے تورات عبرانی زبان میں نازل ہوئی جو اُس وقت پہلے سے بولی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں جو الفاظ استعمال ہوئے‘ وہ اگرچہ سب کے سب اہلِ عرب کی گفتگو میں شامل تھے لیکن جب وہ منتخب ہو کر کلامِ الٰہی کا حصہ بنے تو ان میں ایک اضافی مفہوم شامل ہو گیا اور پھر وہ ایک اصطلاح کی صورت میں سامنے آئے۔ فزکس‘ کیمسٹری‘ فلسفہ غرض کہ ہر مضمون کی اپنی اصطلاحات (terminology) ہوتی ہیں۔ اگر ہم ان اصطلاحات کو نہیں سمجھیں گے تو اُس علم کو بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح ہمارے دین کی بھی بنیادی اصطلاحات ہیں جو کہ عربی زبان سے ماخوذ ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لیے دو پہلوؤں سے غور کرنا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ اس کے لُغوی معنی کیا ہیں‘ یعنی قرآن مجید کے نزول سے پہلے اہلِ عرب اس لفظ کو کن معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ دوم یہ کہ قرآن مجید میں استعمال ہو کر کسی عربی لفظ میں کیا اضافی مفہوم شامل ہوا اور اُسے ایک اصطلاح کی صورت دی۔

عربی کے اکثر و بیشتر الفاظ ایک سہ حرفی مادہ سے بنتے ہیں۔ مثلاً ع ل م سے بے شمار

الفاظ بنتے جاتے ہیں۔ عالم (علم رکھنے والا)' معلّم (علم سکھانے والا)' معلوم (جو بات علم میں ہو)' علامہ (بہت زیادہ علم رکھنے والا)' متعلّم (علم سیکھنے والا) وغیرہ۔ ان تمام الفاظ کا علم سے رشتہ برقرار رہتا ہے لیکن اضافی مفہوم شامل ہوتا جاتا ہے۔

ایمان کا لفظ ''امن'' سے بنا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں کوئی اندیشہ' خطرہ' خوف نہ ہو۔ کوئی غم' فکر' پریشانی و بے چینی نہ ہو۔ گویا ان سب کی نفی سے جو کیفیت وجود میں آئے گی' وہ امن ہے۔ اَمِنَ یَاْمَنُ: امن میں ہونا' آمِنٌ: وہ جو امن میں ہو' مَاْمُوْنٌ: وہ جس سے امن حاصل کرلیا گیا ہو' مَاْمَن: امن کی جگہ' اِیْمَانٌ: امن دینا' مُؤْمِنٌ: امن دینے والا۔ عربی زبان میں جب کسی فعل کے بعد حرفِ جار کا بطور صلہ (preposition) اضافہ ہوجائے تو معنی تبدیل ہوجاتے ہیں۔ آمَنَ بِهٖ: کسی کی تصدیق کرنا۔ آمَنَ لَهٗ: کسی کی بات مان لینا۔ لفظ ایمان پر حرف ''ب'' یا ''لام'' کا اضافہ ہوتا ہے تو مفہوم بدل جاتا ہے۔ ایک شخص کوئی خبر لے کر آئے اور اس کی بات مان لی جائے تو اس صورت میں امن کی کیفیت ہے جبکہ کسی دوسرے شخص کی لائی ہوئی خبر کو نہ مانا جائے تو جھگڑا و فساد ہوگا۔ گویا جب سامنے والے کا دعویٰ قبول کرلیا گیا تو امن و سکون ہے اور اگر تسلیم نہیں کیا گیا تو بحث مباحثہ کا آغاز ہوگا' یعنی بدامنی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ زبان کے ساتھ ہاتھ اُٹھنے کی نوبت بھی آجائے۔

۲) ایمان کے اصطلاحی معنی

قرآن وحدیث میں جب بھی ایمان کا لفظ اصطلاح کے طور پر آتا ہے تو ''ب'' کے اضافہ کے ساتھ آتا ہے۔ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ، کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ، اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ۔ ایمان کے اصطلاحی معنی نبی ﷺ کی بات کی تصدیق کرنا ہیں۔ وہ یہ خبر دیتے ہیں کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر فرشتہ آیا اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ مجھ پر وحی نازل ہو رہی ہے' یعنی میں اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ یہ ایک خبر اور دعویٰ ہے' جس کو مان لینا ہی اصطلاحاً ایمان لے آنا ہے۔ گویا ایمان دراصل تَصْدِيْقٌ بِمَا جَاءَ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ ہے' یعنی ہر اُس بات کی تصدیق کرنا جو نبی اکرم ﷺ لے کر آئے ہیں۔ اسی

لیے کوئی بڑے سے بڑا مؤحد ہو لیکن اگر حضرت محمد ﷺ کو نہ مانے تو مؤمن نہیں کہلائے گا۔ کوئی انتہائی نیک ہو لیکن جب تک حضور ﷺ کی تصدیق نہ کرے' مؤمن نہیں مانا جائے گا۔ ایمان حقیقتاً اور اصطلاحاً یہی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی لائی ہوئی ہر بات کی تصدیق کی جائے۔

۳) ایمان کا موضوع (Subject matter)

ایمان کا موضوع وہی ہے جو فلسفہ کا موضوع ہے۔ ایک انسان جب شعور کی آنکھ کھولتا ہے یعنی ذہنی طور پر بالغ (intellectually mature) ہوجاتا ہے تو اس کے ذہن میں کچھ سوالات آتے ہیں' جن پر اُسے ضرور غور کرنا چاہیے۔ اکثر لوگ چونکہ تقلیدی ذہن رکھتے ہیں اس لیے وہ غور نہیں کرتے۔ جو باتیں معاشرہ میں تسلیم شدہ ہوتی ہیں یا جو والدین و بزرگ تلقین کرتے ہیں' ان کو آنکھ بند کر کے مان لیتے ہیں۔ نہ سوالات کرتے ہیں اور نہ تجزیہ' لہٰذا اس سے آگے سوچتے ہی نہیں۔ کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہوگئے تو اللہ' رسول' آخرت' وحی' فرشتوں کو مانتے ہیں۔ اگر ہندو کے گھر پیدا ہوتے تو رام' کرشن کو مانتے۔ اگر عیسائی کے گھر پیدا ہوتے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے۔ دنیا میں انسانوں کی اکثریت تقلیدی ذہن کی ہوتی ہے لیکن ہر دور اور ہر معاشرہ میں ایسے لوگ بھی ہمیشہ موجود رہے ہیں' خواہ وہ نہایت ہی قلیل اقلیت میں ہوں' جنہوں نے غور وفکر سے کام لیا اور اہم موضوعات کے بارے میں خود سوچا۔ مثلاً:

(i) اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی؟ یا کسی خاص وقت میں وجود میں آئی اور کسی خاص وقت میں ختم ہوجائے گی؟ یہ از خود وجود میں آگئی یا کسی نے پیدا کی؟ آیا یہ خود بخود چل رہی ہے یا کوئی اس کا حاکم ہے؟

(ii) میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ میرے اس دنیا میں آنے سے قبل بھی میری کوئی ہستی تھی یا نہیں؟ اگر تھی تو کیا تھی؟ اس دنیا میں آنے والی موت کیا میرے سفرِ حیات کا خاتمہ ہے یا میرے وجود کا تسلسل اس کے بعد بھی ہوگا؟ اگر ایسا ہے تو اس کی کیفیت کیا ہوگی؟

(iii) خیر اور شر کیا ہے؟ آیا خیر اور شر کی اقدار مستقل ہیں یا بدلتی رہتی ہیں؟ کون سی چیز اس ضمن میں فیصلہ کن ہے جو طے کر سکے کہ خیر اور شر کیا ہیں؟

(iv) انسانی علم کی حقیقت کیا ہے؟ کچھ معلومات تو ہمیں حواسِ ظاہری سے یعنی دیکھ کر‘ چکھ کر‘ سونگھ کر‘ چھو کر یا سن کر معلوم ہوتی ہیں۔ پھر ہمارے اندر یہ صلاحیت بھی ہے کہ ہم اپنے حواس سے حاصل کردہ sense data کو جمع‘ تفریق کر کے نتیجہ اخذ کرتے ہیں‘ یعنی استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً ہم نے دھواں دیکھا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ آگ لگی ہوئی ہے۔ اگرچہ ہم نے آگ کو براہِ راست نہیں دیکھا لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ جہاں آگ لگتی ہے‘ وہاں پر دھواں ہوتا ہے۔ یہ بات تو ہماری عقل کے دائرہ کے اندر آ جاتی ہے مگر کیا حواس اور عقل سے بالاتر بھی علم کا کوئی ماخذ (source) ہے؟

(v) بھوک کی وجہ سے انسان معاش کی جدّ وجُہد کرتا ہے۔ جنسی خواہش (sexual urge) کی وجہ سے شادی کرتا ہے۔ اگر محرکاتِ عمل صرف یہی ہیں تو کیا ہم میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں؟ ان حیوانی داعیات (instincts) کے علاوہ بھی کیا اور کوئی ایسا داعیہ ہے جس کی وجہ سے ہم حیوان سے ممیز ہو جائیں؟

جنہوں نے فلسفہ کا مطالعہ کیا ہو‘ وہ جانتے ہیں کہ یہ سوالات دراصل فلسفہ کی مختلف شاخیں ہیں۔ مثلاً مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کائنات کی حقیقت سے متعلق ہے۔ Ethics خیر وشر یا اخلاقیات سے بحث کرتی ہے۔ Epistemology علم کی حقیقت سے متعلق اُمور کا احاطہ کرتی ہے۔ Psychology انسانی نفس کے داعیات اور محرکاتِ عمل کے بارے میں علم کا نام ہے۔

ان سوالات کے حتمی جواب دنیا میں نہیں ملتے۔ یہاں تو ایک کہتا ہے کہ یہ کائنات خود بخود بن گئی‘ دوسرا کہتا ہے کہ ایک خدا ہے‘ تیسرا کہتا ہے کہ بہت سارے خدا ہیں‘ چوتھا کہتا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے۔ دنیا میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنہوں نے اپنے دور میں ان سوالات کے تسلیم شدہ جوابات کو تقلیدی ذہن سے تسلیم نہیں کیا بلکہ اپنی عقل‘ غور وفکر‘ سوچ بچار سے حقیقت جاننے کی کوشش کی۔ ان لوگوں کو فلاسفہ وحکماء کہتے ہیں۔

جیسے گوتم بدھ کے اندر سچائی کی تلاش (search for truth) کا داعیہ اتنا شدید ہوا کہ تیس برس کی عمر میں عین اپنی جوانی کے عروج کے وقت‘ ایک بڑی ریاست کپل وستو کا شہزادہ ہونے کے باوجود جوان بیوی اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔ دردر کی خاک چھانتا ہے تاکہ کوئی ایسا صاحبِ بصیرت (enlightened person) مل جائے جسے حقیقت کا سُراغ مل گیا ہو۔ جو کچھ آج گوتم بدھ کی جانب نسبت کیا جاتا ہے‘ وہ صحیح ہو یا نہیں‘ البتہ یہاں پر صرف یہ مثال دی جا رہی ہے کہ ایسا داعیہ کتنا شدید ہوتا ہے۔ یہ جب انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کے لیے دنیا کی کوئی چیز اہم نہیں رہتی۔ اصل حقیقت جاننے کے لیے وہ اپنا سب کچھ لگا سکتا ہے۔

اسی طرح سقراط ایک فلسفی تھا۔ اُس وقت یونان میں جو باتیں مانی جا رہی تھیں‘ اُس نے ان کو تسلیم نہیں کیا اور غور وفکر کر کے اپنے خیالات پیش کرنے شروع کیے۔ کچھ نوجوان اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ معاشرے کو خطرہ محسوس ہوا کہ اس شخص کی وجہ سے تسلیم شدہ نظریات کے خلاف باتیں پھیل رہی ہیں اور نوجوان گمراہ ہو رہے ہیں۔ لہٰذا سقراط کو دو options پیش کیے گئے: یا تو اپنی زبان بند کر لو‘ یا زہر کا پیالہ پی لو۔ اس نے زہر پینا ہی پسند کیا‘ کیونکہ اس کے خیال میں جو حقیقت اُس پر منکشف ہوئی‘ اُس کو بیان کیے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ گویا انسان زندگی جیسی قیمتی شے کو بھی اپنے فکر اور نظریہ کی خاطر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

تیسری مثال حضرت سلمان فارسی ؓ کی ہے۔ ان کے والد ایک بہت بڑے آتش کدہ کے سینئر پجاری تھے اور باپ کے بعد یہ درجہ ان ہی کو ملنا تھا۔ ان کو خیال آیا کہ یہ بات تو عقل کے بالکل منافی ہے کہ جس آگ کو ہم خود جلاتے ہیں‘ اُسی کے آگے ہاتھ جوڑ کر مانگیں۔ یہ سوچ کر انہوں نے ایران چھوڑ کر شام کا رُخ کیا۔ چونکہ بعثتِ نبوی ﷺ سے قبل دینِ عیسوی تھا‘ اس لیے وہ حقیقت کی تلاش میں عیسائی راہبوں کے پاس پہنچے۔ وہاں کافی وقت گزارا۔ پھر ایک زاہد وعارف راہب کے پاس پہنچے۔ جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس سے پوچھا: ’’اب آپ مجھے کس کے حوالے کر رہے ہیں؟‘‘ اس نے بتایا

کہ میرے علم کے مطابق جنوب کی طرف کھجوروں کی سرزمین میں نبی آخرالزماں کے ظہور کا وقت اب قریب ہے۔ ان ہی کے دامن میں پہنچ کر تمہارے علم کی پیاس کو سیری حاصل ہو سکے گی‘ لہٰذا تم اُدھر کا رُخ کرو۔ اس کے انتقال کے بعد حضرت سلمان فارسی ؓ ایک قافلہ کے ساتھ عرب کی طرف روانہ ہوئے۔ قافلہ پر ڈاکوؤں کا حملہ ہوا اور غلام بنا لیے گئے۔ مدینہ کے ایک یہودی نے ان کو خرید لیا۔ یہ تھی طلبِ صادق کہ مدینہ پہنچ گئے۔ ابھی نبی ﷺ کی مدینہ تشریف آوری نہیں ہوئی تھی لیکن خبریں آ رہی تھیں کہ مکہ میں کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ چونکہ غلام تھے‘ تو اپنی مرضی سے مکہ نہیں جا سکتے تھے۔ بہرحال نبی اکرم ﷺ کی مدینہ آمد ہوتی ہے۔ اب سوچتے ہیں کہ کیسے معلوم کروں کہ یہ سچے نبی ہیں یا نہیں! راہب نے یہ پہچان بتائی تھی کہ وہ صدقہ وخیرات قبول نہیں کریں گے‘ البتہ ہدیہ قبول کر لیں گے۔ چنانچہ کچھ کھجوریں لے کر حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور پیش کیں۔ رسول اکرم ﷺ نے پوچھا: ’’یہ کیا ہے؟‘‘ کہا: یہ صدقہ ہے‘ آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’یہ غرباء کا حق ہے‘ اُن میں تقسیم کر دو۔ میں صدقہ قبول نہیں کرتا۔‘‘ کچھ دِنوں بعد کھجوریں لے کر پھر حاضر ہوئے اور کہا: ’’یہ ہدیہ ہے‘ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔‘‘ حضور ﷺ نے قبول فرما لیا۔ پس حضرت سلمان فارسیؓ نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ اگر وہ اپنے معاشرہ کی تسلیم شدہ باتوں کو مان کر ہی زندگی گزار دیتے تو ان کو اسلام و ایمان کی دولت کبھی نصیب نہ ہوتی۔

اسی طرح ورقہ بن نوفل تھے جو بتوں کی پرستش سے بیزار ہو کر مکہ سے شام گئے اور اُس وقت کے آسمانی دین یعنی عیسائیت کو قبول کیا۔ عبرانی زبان میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ تورات کو لکھا کرتے تھے جبکہ مکہ میں عربی لکھنے والے ہی گنتی کے لوگ تھے۔ حضرت خدیجہ ؓ پہلی وحی آنے کے بعد حضور ﷺ کو ان کے پاس ہی لے کر گئی تھیں۔ جب حضور ﷺ نے غارِ حرا میں حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد کا واقعہ ان کو سنایا تو کہنے لگے: ’’یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ کاش کہ میں اُس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو مکہ سے نکال دے گی‘ تا کہ میں

آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔‘‘ حضور ﷺ حیران ہوئے کہ کیا وہ لوگ مجھے نکال دیں گے جو مجھے صادق اور امین کہتے ہیں! جناب ورقہ نے کہا کہ ہاں‘ یہ اللہ تعالیٰ کا پرانا قانون چلا آ رہا ہے کہ جو کوئی حق کی دعوت دیتا ہے تو اس کی قوم اس کی دشمن ہو جاتی ہے۔

اسی طرح کا معاملہ حضرت زید کا بھی تھا‘ جو کعبہ کے پردے پکڑ پکڑ کر کہتے تھے: اے اللہ! میں اِن بتوں کو پوجنا نہیں چاہتا‘ صرف تیری بندگی کرنا چاہتا ہوں مگر مجھے نہیں معلوم کہ تیری پرستش کیسے کروں! ان کا انتقال حضور ﷺ پر وحی کے آغاز سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ ان کے بیٹے حضرت سعید بن زید ؓ تھے‘ جو حضرت عمر فاروق ؓ کے بہنوئی تھے اور جنہوں نے حضور ﷺ کی فوراً تصدیق کی‘ عشرہ مبشرہ میں شامل ہوئے۔ یہی حضرت عمر ؓ کے ایمان لانے کا ذریعہ بنے۔

ان چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ کائنات کے بنیادی حقائق سے متعلق سوالات پر غور کرتے ہیں‘ اللہ تعالیٰ ضرور انہیں حقیقت تک پہنچا دیتا ہے۔

دراصل اِن سوالات کے جواب حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک راستہ اپنی عقل‘ سوچ‘ غور وفکر اور منطق سے نتائج نکالنے کا ہے۔ جو لوگ اس طرح ان سوالات کے جواب دیتے ہیں‘ ان کو فلسفی کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف تاریخ میں کچھ ایسے لوگ ملتے ہیں جنہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ان سوالات کے جواب ہمیں اپنے غور وفکر سے نہیں بلکہ وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو نبی کہا جاتا ہے۔ ایک فلسفی اور نبی میں یہی فرق ہے۔ جب کوئی فلسفی اپنی ذہنی صلاحیتوں سے کوئی نتیجہ پیش کرتا ہے تو یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہی حق ہے‘ بلکہ وہ کہتا ہے کہ ہم یوں سمجھتے ہیں‘ لیکن نبی دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ جو بات ہم تک پہنچی ہے‘ وہی صحیح ہے‘ اس میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے آغاز میں ہی کہا گیا: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ (البقرۃ:۲) ’’یہ الکتاب ہے‘ اس میں کچھ شک نہیں۔‘‘ جب نبی مکرم ﷺ سے قرآن مجید میں تبدیلی کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو یہی جواب دِلوایا گیا کہ میں تو خود سب سے پہلے اس کا پابند ہوں جو مجھ پر وحی کیا جا رہا ہے۔ یہ

میرا قول وکلام ہی نہیں کہ میں الفاظ بدل سکوں۔ اگر یہ میرا فکر وفلسفہ ہوتا تو شاید کوئی ترمیم کر دیتا۔ اس ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بہت پیارا قول سورۂ مریم میں نقل کیا گیا ہے:

﴿يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿٤٣﴾﴾

''ابا جان! میرے پاس علم (وحی) آچکا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' لہٰذا آپ میری پیروی کیجیے' میں آپ کی راہنمائی کروں گا سیدھے راستے کی طرف۔''

اس صورتِ حال میں باپ یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا بیٹا جو حواسِ خمسہ' عمر' عقل اور تجربہ کے لحاظ سے مجھ سے کم ہے' کیسے تقاضا کر رہا ہے کہ میں اس کی پیروی کروں۔ اس کی دلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دی کہ حصولِ علم کا ایک ذریعہ وحی ہے جو کہ آپ کے پاس نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے میرے پاس بھیجی ہے اور اس کی بنیاد پر والد سے یہ مطالبہ کرنا درست ہے۔

ایمان کا موضوع دراصل وہی بنیادی سوالات ہیں جو فلسفہ کے مضمون میں زیرِ بحث آتے ہیں لیکن وہاں ان کے جواب انسانی سوچ بچار' غور وفکر' منطق' تعقّل و تفکّر کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ ایمانیات کے ضمن میں ہم اِن جوابات کا ماخذ وحی الٰہی کو مانتے ہیں۔

۴) ایمانیاتِ ثلاثہ کی تفصیل

حضرت آدم علیہ السلام' حضرت نوح علیہ السلام' حضرت صالح علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام' حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ نے جس ایمان کی دعوت دی' اُس میں کوئی فرق نہیں۔ شریعت کے احکامات' حلال حرام میں تو فرق ہوا ہے لیکن جہاں تک ایمان کا تعلق ہے از آدم تا ایں دم (آج تک) ایمان میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔

ایمانیات کی تفصیل دراصل ان سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے جو کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے دیے۔ اس کی تفصیل کے لیے تین عنوانات قائم کیے گئے ہیں:

(ا) ایمان باللہ (توحید)　　(ب) ایمان بالآخرت (معاد)

(ج) ایمان بالرسالت

(ا) ایمان باللہ: یہ وسیع وعریض کائنات جو تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی ہے' اس کی وسعت سے آج تک ہم لاعلم ہیں۔ کائنات کے حوالے سے پیدا ہونے والے سوالات کا انبیاء کرام علیہم السلام نے یہ جواب دیا کہ: یہ کائنات نہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہمیشہ رہے گی۔ یہ حادث اور فانی ہے۔ ایک خاص وقت میں اس کی تخلیق ہوئی ہے جو ایک خاص وقت تک کے لیے (اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى) ہے۔

یہ خود بخود نہیں بنی' خود بخود نہیں چل رہی اور نہ ہی خود بخود ختم ہوگی۔ اس کا ایک خالق و مدبر ہے جو اس کو چلا رہا ہے۔ جب وہ چاہے گا تو ہی قیامت واقع ہوگی۔ اس کو پیدا کرنے والی' چلانے والی اور ختم کرنے والی ایک ہی ہستی ہے۔

ذات وصفات' اختیارات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ جیسا کوئی اور نہیں۔ جو صفات بھی اس ہستی میں موجود ہیں' وہ تام وکمال ہیں۔ وہ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ، عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ہے۔ اس کی تمام صفات ذاتی' لامحدود اور ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ ان تمام تفصیلات کو ایمان باللہ یا توحید کہا جاتا ہے۔

(ب) ایمان بالآخرۃ: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مخلوقات کا نقطۂ عروج انسان ہے۔ انسان کی زندگی محض اس دنیا تک محدود نہیں بلکہ بہت طویل ہے۔ بہادر شاہ ظفر سے منسوب ایک شعر ہے:؎

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے' دو انتظار میں!

اِس دنیا میں انسان کو جو زندگی ملتی ہے' اس کا شروع کا حصہ تو ناسمجھی کا ہوتا ہے جبکہ آخری حصہ میں دماغی صلاحیتیں اکثر و بیشتر ختم ہونے لگتی ہیں۔ اس طرح عمل کے لحاظ سے مہلتِ عمر تو بہت کم ہی رہ جاتی ہے جس میں کسی نقشہ کار کے مطابق کام کیا جا سکے۔ ذہن اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ اس وسیع وعریض کائنات کی کمال کی مخلوق کی حقیقت محض یہی ہو۔ اصل میں ہماری زندگی کے تین حصے ہیں۔ حیاتِ دُنیوی اور حیاتِ اُخروی سے تو سب ہی واقف ہیں لیکن ہماری زندگی کا آغاز اُس وقت ہوا جب ازل میں اللہ تعالیٰ نے

تمام ارواح کو تخلیق کیا اور اُن سے عہدِ الست لیا گیا: ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۚ شَہِدۡنَا ۚ﴾ (الاعراف:۱۷۲) ’’کیا مَیں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟‘‘ سب نے کہا: ’’کیوں نہیں! ہم اِس پر گواہ ہیں (اے اللہ! تُو ہی ہمارا رب ہے)۔‘‘ یہ زندگی کا وہ حصہ تھا جسے ہم گزار کر آئے ہیں مگر اُس وقت ہماری صرف روح تھی‘ جسد نہیں تھا۔ پھر ہماری روح کو جسم کے ساتھ شامل کر کے اِس دنیا میں بھیج دیا گیا جو کہ ہماری حیاتِ دُنیوی ہے۔ اس کے بعد وہ وقت آئے گا جب جسم تو زمین میں دفن کر دیا جائے گا اور روح جہاں سے آئی تھی وہیں واپس لوٹ جائے گی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ! انسانی زندگی کی اصل حقیقت جسم نہیں بلکہ روح ہے۔ ﴿مِنۡہَا خَلَقۡنٰکُمۡ وَ فِیۡہَا نُعِیۡدُکُمۡ وَ مِنۡہَا نُخۡرِجُکُمۡ تَارَۃً اُخۡرٰی ﴿۵۵﴾﴾ (طٰہٰ) ’’اسی (زمین) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے‘ اور اسی میں سے ہم تمہیں ایک مرتبہ پھر نکالیں گے۔‘‘

ہماری طویل زندگی کے درمیان میں موت کا ایک سلسلہ رکھا گیا ہے تا کہ اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ ہمیں جو دُنیاوی زندگی ملتی ہے وہ دراصل ایک امتحانی وقفہ ہے۔ جس طرح سے ہم تعلیم کے حوالہ سے تین گھنٹہ کے امتحان سے واقف ہیں‘ اِن دونوں امتحانوں میں quantitative فرق تو ہے لیکن qualitative فرق نہیں۔ ہم اپنی زندگی کے پرچہ کو اپنے افعال‘ اعمال‘ اقوال‘ سعی و جہد سے بھر رہے ہیں۔

﴿الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک:۲)

’’اُس نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو تا کہ وہ تمہیں جانچے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے اچھا ہے۔‘‘

علامہ اقبال نے انسانی زندگی کی بہت خوب صورت ترجمانی ان قیمتی اشعار میں کی ہے: ؎

بر تر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اِسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں‘ پیہم دواں‘ ہر دم جواں ہے زندگی!

قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

ہر امتحان کا نتیجہ بھی ضرور نکلتا ہے۔ سو ہمارے لیے وہ دن ہے یوم القیامۃ (Day of Judgment)۔ وہی دن ہو گا ہار اور جیت کے فیصلہ کا دن ﴿ذٰلِکَ یَوۡمُ التَّغَابُنِ ؕ﴾ کہ کون زندگی کے امتحان میں کامیاب ٹھہرا اور کون ناکام! اصل کامیابی یہی ہے کہ ہمیشہ کے لیے جنت نصیب ہو جائے اور ناکامی یہ ہے کہ جہنم کا ٹھکانا مقدر بنے۔ انسانی زندگی کے حوالے سے ان تمام تفصیلات کو ایمان بالآخرت یا معاد کا نام دیا جاتا ہے۔

(ج) ایمان بالرسالت: ایک بہت اہم سوال علم سے متعلق ہے۔ انسان کو حواس و عقل کے ذرائع سے جو علم حاصل ہوتا ہے‘ وہ یقیناً درست ہے اور اس سے وہ حقیقت کے قریب بھی پہنچ جاتا ہے لیکن محض عقل سے یقین کی دولت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس عقل سے انسان خالق کو تو پہچان سکتا ہے‘ یہ بھی جان سکتا ہے کہ زندگی یونہی ختم نہیں ہو گی بلکہ جزا و سزا اور حساب کتاب ہونا چاہیے تا کہ خیر اور شر کا تصور قائم رہے‘ لیکن علم کا یہ ذریعہ اس کی پوری زندگی گزارنے کے لیے اصل ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔ اس بات کا اعتراف ایک مغربی فلسفی کانٹ نے بھی کیا۔ اُس نے کہا: ’’انسانی اخلاقیات کے لیے کوئی بنیاد نہیں جب تک خدا کو نہ مانا جائے۔‘‘ انسان نیکی کو تو پہچانتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ: نیکی کیوں کی جائے؟ سچ بولنا اچھا ہے لیکن اس میں نقصان ہے‘ تو پھر سچ کیوں بولا جائے؟ جھوٹ بولنا بُرا ہے لیکن انسان کیوں جھوٹ نہ بولے جبکہ اس میں فائدہ ہے؟ اس ’’کیوں‘‘ کا کوئی جواب دنیاوی علم سے نہیں مل سکتا۔ انسان کو نیکی کرنے اور بُرائی سے روکنے والی ایک ہی شے ہے‘ اور وہ ہے اللہ پر ایمان۔ یعنی جو بات کانٹ نے کہی‘ وہ یقیناً درست ہے کہ خدا پر ایمان کے بغیر اخلاق کی واقعی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

قرآن مجید انسان کو اپنے حواس سے علم حاصل کرنے کی نفی نہیں کرتا بلکہ اسے اس جانب متوجہ کیا گیا ہے:

﴿اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ﴿۱۷﴾ وَ اِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ

رُفِعَتْ﴿١٨﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ﴿١٩﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ﴿٢٠﴾﴾ (الغاشیہ)

''کیا وہ نہیں دیکھتے اونٹ کی طرف کہ اس کو کیسے بنایا گیا ہے؟ اور (کیا وہ نہیں دیکھتے) آسمان کی طرف کہ اسے کیسے بلند کیا گیا ہے؟ اور (کیا نہیں دیکھتے) پہاڑوں کی طرف کہ انہیں کیسے جما دیا گیا ہے؟ اور زمین کی طرف کہ اسے کیسے بچھا دیا گیا ہے؟''

بقولِ اقبال: ؎

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

اسی طرح قرآن مجید میں بار بار تعقل اور تفکّر کی دعوت دی گئی ہے: اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ، اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ، اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ ۔ گویا علم کا یہ source یقیناً صحیح ہے لیکن اس کی کچھ حدود ہیں۔ یہ حقیقت کے دروازے تک تو پہنچا دیتا ہے لیکن اندر داخل نہیں کر سکتا۔ اس کی ترجمانی علامہ اقبال نے بہت خوب صورت انداز میں یوں کی: ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے!

اور: ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں!

حقیقت کے حضور میں انسان کی حاضری اور علم الیقین کا حصول صرف وحی کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے کہ اس نے انسان کو محض عقل اور حواسِ ظاہری کے حوالے کر کے نہیں چھوڑا بلکہ اس کی ان تمام صلاحیتوں کی مزید جلا کا اہتمام بھی کیا۔ وہ یوں کہ سیرت و کردار کی معراج پر فائز اپنے چنے ہوئے بندوں پر وحی نازل کر کے ان کے ذریعہ ہدایت بھیجی، جنہوں نے تمام تر مخالفتوں کے باوجود خلقِ خدا کو حقیقت کا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ادا کی۔ ان لوگوں نے نہ صرف انفرادی سطح پر بلکہ اجتماعی سطح پر

بھی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نظام قائم کر کے دکھایا۔ نسلِ آدم کی یہ جلیل القدر ہستیاں انبیاء کرام علیہم السلام کہلاتی ہیں۔

﴿اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ﴾ (الحج:75)

''اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے رسول۔''

حضرت جبریل علیہ السلام نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے وحی لے کر حضرت محمد ﷺ تک پہنچائی، جسے آپ ﷺ نے انسانوں تک پہنچایا۔ رسالت کی یہ دو کڑیاں رسولِ مَلک اور رسولِ بشر ہیں۔ ان دونوں کے اتصال سے وحی کا عمل مکمل ہوا۔ اصل میں تو وحی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جبکہ حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ تو اس کو پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ رسول اکرم ﷺ کی سوچ، فکر اور عقل وحی کا منبع نہیں۔ انہوں نے تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت وصول کر کے لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری ادا فرمائی۔ نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ اپنے نقطۂ عروج (zenith) پر پہنچا خاتم النّبیین حضرت محمد ﷺ پر جو کہ آخر المرسلین و رحمۃٌ للعالمین ہیں۔ ان کو جو ہدایت عطا کی گئی، وہ ہے القرآن یا الہدیٰ (The Complete Guidance)۔ ان تمام حقائق کو مان لینا ایمان بالرسالت ہے۔

۵) ایمانیاتِ ثلاثہ کی تقابلی اہمیت (Relative Importance)

یہ تینوں ایمان ایک ایک اعتبار سے اپنی جگہ پر اہم ترین ہیں۔ اُصولی، علمی، نظری اعتبار سے اہم ترین ایمان باللہ ہی ہے۔ اصل میں ایمان، ایمان باللہ ہی ہے۔ اسی میں سارے ایمان موجود ہیں۔ ایمان باللہ کی وضاحت ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصل کے الفاظ سے ہو جاتی ہے۔ میری تعلیم کا آغاز 'الحمدللہ' نورانی قاعدہ اور ''تعلیم الاسلام'' (از مفتی کفایت اللہ) سے ہوا تھا۔ آج تو بہت مایوس کن صورت حال ہے۔ ہمارے دور میں بچوں کو یہ کلمات ان کی تعلیم کے آغاز ہی پر یاد کرا دیے جاتے تھے، جبکہ آج بچے کو سب سے پہلے کنڈرگارٹن بھیجا جاتا ہے جہاں وہ انگریزی کے الفاظ بولنا تو سیکھ جاتا ہے مگر کلمات اور ایمانیات اُسے یاد نہیں ہوتے۔ حفیظ جالندھری نے ''شاہنامہ اسلام'' کے شروع میں اپنے بارے میں یہ شعر لکھا: ؎

مجھے مسجد سے مکتب کی طرف تقدیر نے کھینچا
تنازع للبقا کی آہنی زنجیر نے کھینچا

یعنی ان کے والدین نے ان کو زمانہ کے رواج کے مطابق مسجد سے اسکول میں داخل کروا دیا تاکہ وہ ایسا علم حاصل کر سکیں جس کی دنیا میں قدر و قیمت ہے۔ دراصل اس تنازع للبقاء (struggle for existence) ہی نے نظامِ تعلیم کو بدل ڈالا ہے۔ بہرحال ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصل کے کلمات حدیثِ مبارکہ میں تو نہیں لیکن جس عالم یا امام نے بھی یہ منتخب کیے ہیں' انتہائی جامع الفاظ ہیں۔

ایمانِ مجمل: آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَ صِفَاتِہٖ وَ قَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ

ایمانِ مفصل: آمَنْتُ بِاللّٰہِ وَ مَلٰئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

اجمالاً ایمان تو ایمان باللہ ہے جبکہ باقی ایمانیات اسی کی تفصیل ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفت ہے الھادی اور اسی کی توسیع یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا اہتمام کیا گیا۔ اس کی صفتِ ہدایت کا ظہور وحی' نبوت و رسالت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی صفت ہے العادل یعنی انصاف کرنے والا۔ اس صفت کا ظہور آخرت میں یوں ہوگا کہ نیکوکار کو اس کی نیکی کی جزا اور بدکار کو اس کی بدی کی سزا مل کر رہے گی' اور یہی ایمان بالآخرت ہے۔ گویا یہ دونوں ایمانیات دراصل ایمان باللہ ہی کی شاخیں ہیں۔ حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی ؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: اے اللہ کے رسول! مجھے اسلام کے بارے میں ایسی جامع بات بتائیے کہ آپؐ کے بعد کسی سے اس کے بارے میں سوال کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) (صحیح مسلم' کتاب الایمان' ح:۱۵۹) ''کہو: میں ایمان لایا اللہ پر' پھر اس پر ثابت قدم ہو جاؤ!''

قانونی' شرعی' فقہی اعتبار سے اصل ایمان' ایمان بالرسالت ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی

اللہ کو مانے' کتنا ہی موحد ہو' متوکل ہو لیکن مومن نہیں کہلائے گا جب تک حضرت محمد ﷺ کو نہ مانے۔ قانونی طور پر ایک مسلم اور غیر مسلم میں یہی فرق ہے' جس کا سارا دارومدار ایمان بالرسالت پر ہے۔ ایمان بالرسالت کے ضمن میں ختم نبوت پر ایمان بھی لازمی ہے۔ کوئی کتنا ہی بااخلاق' پاک باز' سچا' دیانت دار' ملنسار' خادمِ خلق ہو لیکن اگر نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا اور ختم نبوت کا انکار کر دے تو وہ قانونی لحاظ سے مسلمان نہیں۔ یہ ایمان بالرسالت کی قانونی اہمیت ہے۔

عملی اور اخلاقی اعتبار سے اہم ترین ایمان' ایمان بالآخرت ہے۔ اگر آخرت کا خوف اور جواب دہی کا احساس ہوگا تو انسان ہر قدم پھونک پھونک کر رکھے گا کہ میں اپنے عمل کو اللہ کے حضور justify بھی کر سکوں گا یا نہیں۔ دراصل آخرت کا خوف ہی انسان کے عمل کو درست رکھ سکتا ہے' ورنہ ایمان باللہ محض ذات و صفات کی بحث یا علمِ کلام کا معاملہ بن جاتا ہے' جیسا کہ علامہ اقبال کا یہ شعر اس دینی حقیقت کی بھرپور تعبیر کرتا ہے: ؎

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اِک مسئلہ علم کلام!

یعنی وہ توحید جو انسانی کردار کو تبدیل کرنے اور اللہ کا رنگ اختیار کر دینے پر مجبور کر دیتی تھی' آج وہ محض چند مسائل کی بحث میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ایسے میں ایمان بالرسالت محض عشقِ رسولؐ کے بلند بانگ دعوے کی وہ شکل اختیار کر لیتا ہے جو آج ہمارے معاشرہ میں نظر آتی ہے۔ جلسے' چراغاں' نعتیں سب کچھ ہو رہا ہے لیکن حقیقی اور عملی اعتبار سے اتباعِ رسول ﷺ موجود نہیں۔

آج ہم آخرت کو مانتے تو ہیں لیکن اپنی تاثیر کے لحاظ سے آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ اس کی ایک وجہ تو ہماری وہ سوچ ہے جو یہودیوں کا تصور تھا کہ ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ ؕ﴾ (المائدۃ:۱۸) ''ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں'' اور ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً ؕ﴾ (البقرۃ:۸۰) ''آگ ہمیں نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔'' یعنی اب ہمیں کسی بات کا کوئی ڈر اور خوف نہیں' جہنم ہوگی بھی تو دوسروں کے

لیے ہو گی۔ یہی بات ہمارے ذہن میں بھی بیٹھی ہوئی ہے کہ ہم جیسے بھی ہیں مگر تیرے محبوبؐ کے اُمّتی ہیں‘ اس لیے اس بات کے دعوے دار ہیں کہ جنت ہمارا پیدائشی حق ہے‘ ہمیں اس سے کوئی محروم کر ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا آخرت پر ایمان کا ہمارے کردار‘ اخلاق اور عمل پر کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا‘ اس لیے کہ اس نظریہ نے آخرت کے خوف کی نفی کر دی ہے جس کی وجہ سے عمل درست نہیں ہوتا۔ ہم قرآن مجید پر ایمان کے دعوے دار ہیں مگر اس میں جس شے کو حرام ٹھہرایا گیا‘ اسے اپنے لیے جائز کر رکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهُ)) (سنن الترمذی:۲۹۱۸)

’’جو قرآن مجید کے حرام کردہ امور کو اپنے لیے حلال ٹھہرا لے‘ اس کا قرآن پر کوئی ایمان نہیں۔‘‘

دوسری وجہ سورۃ العلق میں بیان ہوئی:

﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝٦ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝٧ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝٨﴾

’’ہرگز نہیں‘ بے شک انسان یقیناً سرکشی کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ دیکھتا ہے اپنے آپ کو بے پروا۔ (اے نبیؐ!) بے شک آپ کے رب کی طرف ہی لوٹنا ہے۔‘‘

انسان بغاوت‘ سرکشی‘ دست درازی‘ حق تلفی کر بیٹھتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں کوئی پکڑ نہیں۔ جھوٹ بولنے‘ حرام خوری کرنے پر فوری سزا نہیں اور اس کے باوجود بھی لوگ میری عزت کر رہے ہیں تو پھر میں اس کو کیوں چھوڑوں! اس طرح انسان ظلم و تعدّی‘ سرکشی و غلط کاری میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ دنیا میں اگرچہ فوری سزا نہیں ملتی لیکن جان لینا چاہیے کہ ایک دن رب کی طرف واپسی ہو کر رہے گی جہاں ہر ایک کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک خطبہ میں ایمان بالآخرت پر کس قدر زور دیا ہے‘ ملاحظہ کیجیے:

((وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ، وَلَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ، وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، وَلَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءًا، وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا))

’’اللہ کی قسم! تم سب یقیناً مر جاؤ گے جیسے روزانہ رات کو سو جاتے ہو۔ پھر یقیناً اُٹھائے جاؤ گے جیسے صبح بیدار ہوتے ہو۔ پھر لازماً تمہارا حساب لیا جائے گا تمہارے اُن اعمال کا جو تم کرتے ہو‘ اور پھر تمہیں لازماً بدلہ مل کر رہے گا‘ بھلائی کا اچھا بدلہ اور بُرائی کی بری سزا‘ اور وہ ہے ہمیشہ ہمیش کے لیے جنت یا ہمیشہ ہمیش کے لیے نارِ جہنم۔‘‘

قرآن مجید کی آخری پارہ کی سورتوں میں سارا زور آخرت ہی پر ہے: ﴿اَلْحَآقَّةُ ۝١ مَا الْحَآقَّةُ ۝٢﴾ (الحآقة) ’’وہ حق ہو جانے والی! کیا ہے وہ حق ہو جانے والی؟‘‘ — ﴿اَلْقَارِعَةُ ۝١ مَا الْقَارِعَةُ ۝٢﴾ (القارعة) ’’وہ کھٹکھٹانے والی! وہ کھٹکھٹانے والی کیا ہے!‘‘ — ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝١ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝٢﴾ (النبا) ’’کس چیز کے بارے میں یہ لوگ آپس میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟ اُس بڑی خبر کے بارے میں۔‘‘

انسان کے کردار کی بلندی اور عمل کی درستگی کا دارومدار ایمان بالآخرۃ ہی پر ہے۔

پس ایمانیاتِ ثلاثہ کے ایک دوسرے کے اعتبار سے نسبت و تناسب کو الجبرا کے فارمولے کے طریقہ سے یہ حقیقت ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اُصولی‘ علمی‘ نظری اعتبار سے اہم ترین ایمان‘ ایمان باللہ ہے۔ قانونی‘ شرعی‘ فقہی اعتبار سے اصل اہمیت‘ ایمان بالرسالت کی ہے۔ عملی اور اخلاقی اعتبار سے اہم ترین ایمان‘ ایمان بالآخرت ہے۔

۶) ایمان کے دو درجے

یہ اہم ترین موضوع ہے۔ ایمان کے یوں تو بے شمار درجات ہیں۔ ایک میرا‘ آپ کا ایمان ہے۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ‘ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایمان کی سطح ہے۔ ان کے درمیان کتنے ہی درجے ہوں گے جن کو گننا ناممکن ہے‘ کوئی نسبت و تناسب ہے ہی نہیں۔ البتہ ہم یہاں پر ایمان کو دو درجوں میں تقسیم کریں گے:

(ا) قانونی ایمان (اسلام) (ب) حقیقی ایمان (یقین)

ایمان کا لفظی مطلب ماننا ہے۔ یعنی اللہ‘ اُس کے اسماء و صفات‘ آخرت‘ قیامت‘ بعث بعد الموت کو زبان سے مان لیا جائے۔ یہ پہلا درجہ ہے کہ ایک شخص کلمہ شہادت پڑھ

لے یعنی اقرار باللسان کرے تو چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، دنیا میں اب مسلمان مانا جائے گا۔ اگر بعد میں وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے کسی بات کا منکر ہو، مثلاً ختم نبوت کا انکار کرے، تو پھر اس کی تکفیر کی جائے گی۔ بہر حال اسلام کا تعلق اقرار باللسان سے ہے، یعنی زبان سے تصدیق کی ہو۔ اگر دل سے تصدیق نہ کرے تو اسلام تو ہوگا مگر حقیقی ایمان نہیں۔

دوسرا درجہ حقیقی ایمان کا ہے جو دل کی تصدیق سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ آج تک دنیا میں کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں ہوسکا جس سے دل کا ایمان جانچا جاسکے۔ اس لیے قانونی طور پر مسلمان ہونے اور دیگر دنیاوی معاملات (وراثت، اسلامی شہریت کی بنیاد پر حقوق) کے لیے صرف اقرار باللسان کافی ہے۔ حضرت اسامہ بن زید ؓ کے سامنے ایک کافر نے عین حالتِ جنگ میں اُس وقت کلمہ پڑھ لیا جب وہ ان کی تلوار کی زد میں تھا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ شخص محض جان بچانے کے لیے حیلہ کر رہا ہے، اس لیے اس کو قتل کر دیا۔ جب یہ واقعہ حضور ﷺ سے بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اے اسامہ! تم روزِ قیامت کیا جواب دو گے اگر یہ کلمہ تمہارے خلاف گواہی دے گا؟'' یہ قانونی ایمان (شہادت) کی اہمیت ہے۔

اسی طرح کا معاملہ اُس وقت ہوا جب حضرت عثمان غنی ؓ کی خلافت کے خلاف محاصرہ کیا گیا۔ ۵۰ دن گزر گئے، ان تک پانی بھی نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ حضرت عثمان ؓ کو بھی معلوم تھا کہ یہ لوگ فتنہ برپا کر رہے ہیں لیکن انہوں نے کلمہ شہادت کو ڈھال بنایا ہوا تھا۔ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ حضرت عثمان ؓ نے کمزوری نہیں دکھائی بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ اپنی تلوار سے کسی کلمہ گو کا خون نہیں کر سکتے، اُن لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی، کیونکہ اُس وقت تک ان کا کوئی جرم ثابت نہیں ہوا تھا۔ حضرت عثمان ؓ نے کہا کہ یہ لوگ اگر مجھے شہید کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں، لیکن میں اپنی جان کی حفاظت کے لیے کسی کلمہ گو کا خون نہیں بہاؤں گا۔

یہ قانونی ایمان دنیا میں تو کام آجائے گا لیکن آخرت میں ہمارا معاملہ اُس ہستی کے سامنے پیش ہوگا جو عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ہے، جس کی شان یَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَ مَا

تُعۡلِنُوۡنَ ہے۔ لہٰذا اگر اقرار باللسان ہے لیکن تصدیق بالقلب نہیں تو یہ ایمان اگرچہ دنیا میں تو معتبر ہو جائے گا لیکن آخرت میں معاملہ حقیقی ایمان کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ جس کے پاس یہ دولت ہے، وہی مومن تسلیم کیا جائے گا۔ اگر قلبی تصدیق نہ ہوئی تو دنیا میں چاہے وہ مسلمانوں کا بڑا قائد و رہنما سمجھا جاتا ہو، بڑی سے بڑی سند اس کے پاس ہو لیکن سب بے کار ہوگا۔ وہاں محض اقرار باللسان کام نہ آسکے گا بلکہ اصل شے تصدیق بالقلب ہوگی۔ اسی لیے ایمان مجمل میں ان دونوں کی اہمیت واضح کر دی گئی۔

اس حوالہ سے ایک انتہا پر خوارج تھے، جو گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے کو مرتد کہتے اور پھر تکفیر کی وجہ سے اس کو واجب القتل قرار دے دیتے۔ یہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی، کیونکہ دنیا میں تو مسلمان ہونے کے لیے اقرار باللسان ہی کافی ہوتا ہے۔ اگر کوئی نماز نہ پڑھے، روزہ نہ رکھے، زکوٰۃ کا اہتمام نہ کرے تو یہ گناہ تو ہے لیکن کفر اس وقت شمار ہوگا جب نماز، روزہ، زکوٰۃ یا دین کے کسی بنیادی حکم کا انکاری ہو جائے۔ دوسری انتہا پر ہم اس اعتبار سے پہنچ گئے ہیں کہ جو بھی بدعملی کرتے رہیں مگر قانونی طور پر مسلمان ہونے پر مطمئن ہیں۔ آخرت میں کامیابی کے لیے جو اصل شے مطلوب ہے یعنی تصدیق بالقلب، اس کے حصول کے لیے فکر نہیں کرتے۔

۷) ایمان اور عمل کا تعلق

اِس موضوع کو بانی محترم نے ''عملِ صالح'' کے عنوان سے خطاب میں بیان کیا ہے۔

(۸) ایمان اور جہاد کا تعلق

اِس موضوع کو بانی محترم نے ''تواصی بالحق'' کے عنوان سے خطاب میں بیان کیا ہے۔

۹) ایمان اور امن کا تعلق

اگر حقیقی ایمان موجود ہو تو باطنی سکون اور قلبی اطمینان ضرور حاصل ہوتا ہے۔ سورۃ الانعام میں فرمایا گیا:

﴿فَاَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ اَحَقُّ بِالۡاَمۡنِ ۚ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ

يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

''تو بتاؤ مجھے دونوں فریقوں (مؤمن/مشرک) میں سے کون سا فریق امن کا زیادہ حق دار ہے' اگر تم جانتے ہو۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنی جان کے ساتھ کسی ظلم کو ملوث نہیں کیا' انہی کے لیے امن ہو گا اور وہی ہدایت پر ہیں۔''

اسی طرح نیا چاند نکلنے پر مسنون دعا ہے:

اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهُ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَ السَّلَامَةِ وَ الْاِسْلَامِ

''اے اللہ! اس (چاند) کو ہمارے لیے امن و ایمان اور سلامتی اور اسلام کا ذریعہ بنادے۔''

سورۃ الانعام کی اس آیت اور مذکورہ دعائے مسنونہ کو سامنے رکھتے ہوئے ایمان اور امن کا تعلق سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کو چلانے والی ہستی السَّمِيْع و الْبَصِيْر ہے۔ اُس کے اِذن کے بغیر ایک پتّا بھی نہیں ہِل سکتا۔ اُس کی ربوبیت پر اگر ایمان کامل ہو جائے تو انسان کو کوئی خوف نہیں رہتا۔ سورۂ حٰمٓ السجدہ میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ (آیت ۳۰)

''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر ثابتِ قدم رہے اُن پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے کہ آپ لوگ ڈرو نہیں اور غمگین نہ ہو۔''

اگر انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ اللہ میرا مددگار' دوست' پشت پناہ' محافظ' حمایتی ہے تو اُسے کوئی ڈر' خوف' غم نہیں رہ سکتا' کیونکہ اللہ تعالیٰ واقعی اہلِ ایمان کا ولی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (آیت ۲۵۷) ''اللہ ولی ہے اہلِ ایمان کا' وہ انہیں نکالتا رہتا ہے تاریکیوں سے نور کی طرف۔'' لہٰذا انسان یہ تصور کرلے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے بڑھ کر بالاتر قوت تو کوئی

ہے ہی نہیں' اس کے ارادہ ومشیت کے خلاف تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی بات رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے فرمائی' جس کو ایمان کا حاصل قرار دیا جاسکتا ہے:

((وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ، وَلَوِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ)) (سنن الترمذی:۲۵۱۶)

''جان لو! اگر تمام انسان مل کر تمہیں کچھ نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر جو کچھ اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے' اور تمام انسان مل کر تمہیں کچھ نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔''

اگر اس حدیثِ نبوی ﷺ پر دل کی گہرائیوں سے ہمارا ایمان ہو تو دُنیاوی خوف خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ کسی شخص میں یہ صلاحیت نہیں کہ کسی دوسرے کا نقصان کروا سکے یا اس کی ضرورت پوری کر دے۔ پھر انسان کیوں کسی کی خوشامد کرے جبکہ سامنے والے کے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں۔

اگر غیر اللہ میں نفع ونقصان کی طاقت سمجھ لی تو یہ شرک ہو گیا۔ اسی لیے ہمیں یہ کلمہ بتایا گیا: لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔ یعنی گناہوں سے بچنے کی طاقت اور نیک اعمال کرنے کی قوت صرف اللہ بزرگ و برتر کی طرف سے ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی ؒ نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے یہی کہا تھا: لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِيْقَةِ وَ لَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰهُ ''اس کائنات میں نہ کوئی فاعلِ حقیقی ہے اور نہ کوئی مؤثر اصلی سوائے اللہ کے۔'' حقیقتاً کسی شے میں کوئی تاثیر نہیں ہے جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے۔ آگ جلا نہیں سکتی' پانی ڈبو نہیں سکتا' زہر ہلاک نہیں کر سکتا' کوئی شے فائدہ نہیں دے سکتی' جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے۔ چنانچہ انسان دَر دَر پر نہ جائے' ہر ایک کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے سوائے اللہ کے۔ نظر تو یہ آ رہا ہوتا ہے کہ پانی پیاس بجھا دیتا ہے' کھانا بھوک مٹاتا ہے لیکن دراصل یہ صلاحیت پانی اور کھانے میں نہیں بلکہ اِذنِ ربّ میں ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

قوم سمندر کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور دیکھا کہ پیچھے فرعون کا لشکر قریب آ گیا ہے تو کہنے لگے کہ اب تو ہم پکڑے گئے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام ایمان افروز جواب دیتے ہیں: ﴿كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾﴾ (الشعراء) ”ہرگز نہیں! یقیناً میرے ساتھ میرا رب ہے‘ وہ ضرور میرے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔“ بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن یہی ایمان بالغیب ہے کہ میرا اللہ میری مدد ضرور کرے گا۔ جب وسائل و ذرائع میسر نہ ہوں تو پھر بھی یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے‘ وہ اسباب کا نہ پابند ہے اور نہ ہی محتاج‘ بلکہ اسباب اُس کے محتاج ہیں۔ اگر یقین کی یہ کیفیت ہو تو ہی ایمان اللہ پر ہے۔ اگر ایسا یقین حاصل نہیں تو ایمان اسباب و ذرائع اور مادیت پر ہو گیا۔

جب غارِ ثور میں نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور کُفّار ڈھونڈتے ہوئے غار کے دہانے تک پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۚ﴾ (التوبۃ: ۴۰) ”غم نہ کرو‘ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“ یہ ہے ایمان باللہ کہ میرا مالک‘ رازق‘ محافظ‘ مددگار‘ پشت پناہ‘ دوست‘ ساتھی‘ میرا اللہ ہی ہے۔ اللہ کی یہ دوستی ہی ایمان کا اصل حاصل ہے۔ اولیاء اللہ کی کوئی ظاہری نشانی ہونا ضروری نہیں۔ جس کے دل میں ایمان راسخ ہو چکا ہو‘ یقین پختہ ہو جائے وہی اللہ کا ولی ہے۔ جسے یہ یقین ہو کہ اللہ ہر آن میرے ساتھ ہے‘ میرا محب اور محبوب وہی ہے‘ اُسے ولایت کا رشتہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اللہ ایمان والوں کو محبوب رکھتا ہے جبکہ ایمان والے اللہ تعالیٰ ہی سے محبت کرتے ہیں۔ ﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾﴾ (یونس) ”آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ زوالِ خوف وحزن کی یہ کیفیت ہی امن ہے۔ یعنی نہ ہر وقت مستقبل کے اندیشوں میں رہیں کہ اب کیا ہوگا اور نہ ماضی کی فکر میں ڈوبے ہوں کہ یہ کیوں ہوا تھا‘ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جو اللہ تعالیٰ پر صحیح ایمان رکھتا ہے وہ اس حقیقت کو جانتا ہے۔ سورۃ الحدید میں فرمایا گیا:

﴿مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٢٢﴾﴾

”نہیں آتی کوئی بھی مصیبت نہ ہی زمین میں اور نہ ہی تمہارے اوپر مگر وہ پہلے سے ایک کتاب میں ہے اس سے پہلے کہ ہم اس کو ظاہر کریں۔ یہ چیز اللہ پر بہت آسان ہے۔“

اسی طرح سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا:

﴿وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾﴾

”ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور وہ تمہارے لیے شر ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے‘ تم نہیں جانتے ہو۔“

اس کے بعد تو بس یہی کیفیت ہونی چاہیے کہ مؤمن اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر کے راضی برضائے رب ہو جائے۔ اگر مالکِ حقیقی کے ساتھ دوستی ہے تو اس کا تقاضا یہی ہے بہ ع ”سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!“ جو ہوگا‘ وہ اُس کے اِذن کے بغیر نہیں ہوگا‘ اور جو کچھ بھی اُس کی مرضی سے ہوگا‘ اس میں خیر ہی خیر ہوگی۔ چاہے وہ شے بظاہر مجھے اچھی نہ لگ رہی ہو‘ میری کوتاہ نظری (short sightedness) کی وجہ سے مجھے وہ پسند نہ آ رہی ہو لیکن ع ”ہرچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!“ ہمارا ساقی جو بھی ہمارے پیالے میں ڈال دے وہ اس کا لطف و کرم ہے۔ اس پر مجھے کوئی رنج و صدمہ‘ کوئی شکوہ و شکایت نہیں۔ جب میری پسند‘ مرضی‘ خواہش اللہ کے حکم سے بڑھ کر ہو جائے تو یہ شرک کی صورت بن سکتی ہے۔ مَا شَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ ”جو اللہ نے چاہا‘ وہ ہوا‘ جو اُس نے نہیں چاہا‘ نہیں ہوا۔“ اختیار اُسی کا ہے‘ میرا نہیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا: ؎

رضائے حق پہ راضی رہ‘ یہ حرفِ آرزو کیسا
خدا خالق‘ خدا مالک‘ خدا کا حکم‘ تُو کیسا!

پس جان لیجیے‘ راضی برضائے رب ہونے کی اسی کیفیت کا نتیجہ ہے زوالِ غم وحزن‘ اور یہی امن ہے جو کہ ایمان کا لُبِّ لُباب ہے۔

۱۰) ایمانِ حقیقی کے حصول کے ذرائع

اس ضمن میں مختلف طبائع کا معاملہ الگ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ٹھنڈے مزاج کے ہوتے ہیں جبکہ کچھ جذباتی‘ کچھ غور وفکر والے جبکہ کچھ متحرک زیادہ ہوتے ہیں۔ حقیقی ایمان کے حصول کا اہم ترین ذریعہ آیاتِ الٰہیہ پر غور وفکر ہے۔

آیاتِ الٰہیہ دراصل آیاتِ آفاقی‘ آیاتِ انفسی اور آیاتِ قرآنی پر مشتمل ہیں اور ان تینوں میں گہرا ربط ہے۔ قرآن مجید میں جن کو ’’اولوا الالباب‘‘ کہا گیا ہے‘ جو عقل مند ہیں‘ غور وفکر کرتے ہیں‘ صدیقین میں سے ہیں‘ اصحابِ دانش وبینش (intellectuals) ہیں‘ ان کے ایمان کا اصل ذریعہ یہی ہے۔ ان نشانیوں پر غور وفکر کر کے انسان اعلیٰ درجہ کا شعوری ایمان حاصل کرسکتا ہے جو کہ دراصل مطلوب ہے۔ آیاتِ آفاقی یعنی چاند‘ سورج ہواؤں کو دیکھ کر۔ پھر آیاتِ انفسی کہ اپنے اندر جھانکا جائے۔ ع ’’اپنے مَن میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی‘‘ اسی طرح قرآن مجید کی آیات میں ایمان رچا بسا ہوا ہے‘ اس سے استفادہ کیا جائے: ع ’’قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!‘‘

غیر شعوری ایمان کی تحصیل عوام کے لیے ہے‘ یعنی جن کے پاس غور وفکر کے مواقع یا صلاحیت نہیں۔ اس کے لیے دو راستے ہیں:

(الف) **یقین بذریعہ صحبت:** صاحبِ یقین کی صحبت سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ جن لوگوں کے اندر ایمان نظر آتا ہو‘ ان کے ساتھ رہیں۔ جیسے کمرہ میں اگر برف رکھی ہوگی تو کمرہ ٹھنڈا ہوگا اور آگ کے قریب جائیں گے تو حرارت محسوس ہوگی‘ اسی طرح ایسے لوگوں کی صحبت میں رہنے سے ایمان میں یقیناً اضافہ ہوتا ہے۔ سورۃ التوبہ میں بھی ارشاد پاک ہے: ﴿وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۱۹﴾ ’’اور راست باز لوگوں کی معیت اختیار کرو۔‘‘

(ب) **یقین بذریعہ عمل:** غیر شعوری ایمان کے حصول کی دوسری صورت اعمالِ صالحہ پر مداومت بھی ہے‘ کیونکہ جیسے انسان کا یقین اس کو عمل کی جانب لے جاتا ہے ویسے ہی عمل کرنے سے بھی یقین کی کیفیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ سورۃ الحجرات میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ

الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝۷﴾

’’لیکن (اے نبی ﷺ کے ساتھیو!) اللہ نے تمہارے نزدیک ایمان کو بہت محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں کے اندر کھبا دیا ہے‘ اور اُس نے تمہارے نزدیک بہت ناپسندیدہ بنا دیا ہے کفر‘ فسق اور نافرمانی کو۔ یہی لوگ ہیں جو صحیح راستے پر ہیں۔‘‘

آخر میں ایمان کے حوالے سے ہمارے لیے ایک انتہائی خوش کُن حدیث مشکوٰۃ شریف سے پیش ہے:

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے پوچھا: ((أَيُّ الْخَلْقِ أَعْجَبُ إِلَيْكُمْ إِيمَانًا؟)) ’’تمہارے نزدیک مخلوقات میں سے اَعجب (سب سے زیادہ دل فریب) ایمان کے حامل کون ہیں؟ [عربی میں عجیب دراصل خوب صورت یا دل کو لبھانے والی چیز کو کہتے ہیں جبکہ اردو میں عجیب کا مفہوم غیر معمولی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔] صحابہؓ نے عرض کیا: الملائكةُ ’’فرشتے!‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ؟)) ’’وہ کیسے ایمان نہ لائیں جبکہ وہ تو اپنے رب کے پاس ہی ہیں؟‘‘ دوسری مرتبہ صحابہؓ نے عرض کیا: فَالنَّبِيُّونَ ’’پھر انبیاء ورُسل!‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ وَالْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ؟)) ’’وہ کیسے ایمان نہ لائیں‘ اُن پر تو وحی نازل ہوتی ہے!‘‘ پھر صحابہ کرامؓ نے بڑی جراَت کر کے عرض کیا: ((فَنَحْنُ)) ’’پھر ہم ہیں!‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ)) ’’تم کیسے ایمان نہ لاتے جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں!‘‘ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ أَعْجَبَ الْخَلْقِ إِلَيَّ إِيمَانًا لَقَوْمٌ يَكُونُونَ مِنْ بَعْدِي يَجِدُونَ صُحُفًا فِيهَا كِتَابٌ يُؤْمِنُونَ بِمَا فِيهَا)) ’’میرے نزدیک مخلوق میں خوب صورت ترین ایمان اُن لوگوں کا ہوگا جو میرے بعد آئیں گے۔ وہ اللہ کی کتاب کو اوراق میں درج پائیں گے اور اس پر ایمان لائیں گے۔‘‘ (باقی صفحہ 84 پر)

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۷)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

آیات ۲۱ تا ۲۴

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاۗءَ بِنَاۗءً ۠
وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا
لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا
فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا
النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

دعوت وحکمتِ قرآنی کا خلاصہ

سورۃ البقرہ کے تیسرے اور چوتھے رکوع کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ ان میں مکی قرآن کا ایک لحاظ سے لُبِ لُباب اور خلاصہ آ گیا ہے۔ قرآن حکیم کی بنیادی دعوت کیا ہے؟ اس کے اساسی نظریات کیا ہیں؟ اس کا بنیادی فلسفہ کیا ہے؟ ان تین سوالات کے جوابات ان دو رکوعوں میں آئے ہیں۔ دعوت اور حکمتِ قرآنی کے مضامین اصلاً مکی قرآن کے ہیں۔ قرآن مجید کا جو حصہ ہجرت سے قبل نازل ہوا ہے‘ اس کا اصل مضمون ہے: ’’ایمان‘‘۔ توحید کی دعوت‘ بندگیٔ ربّ کی دعوت‘ معاد یعنی آخرت کو ماننے کی دعوت‘ نبوت و رسالت کو تسلیم کرنے کی دعوت‘ یہ درحقیقت مکّی قرآن کے بنیادی مضامین ہیں۔ ہر دعوت

کے لیے کوئی نہ کوئی نظریاتی اساس ہوتی ہے۔ اس کی کوئی حکمت‘ کوئی فلسفہ اور کوئی میٹافزکس ہوتی ہے جس کے اعتبار سے انسان اور علم کی حقیقت کے بارے میں کچھ بنیادی تصورات کی بنیاد پر وہ دعوت کھڑی ہوتی ہے۔ ان تمام چیزوں کو قرآن کریم نے اصلاً مکی سورتوں میں بیان کیا ہے۔ یہاں بنی اسرائیل سے خطاب سے قبل اس دعوت وحکمت کا جامع ترین خلاصہ ان دو رکوعوں کی انیس آیات کے اندر جمع کر دیا گیا ہے۔

ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف میں فرق کی حکمت: اس حوالے سے ایک بڑا اہم سوال ہے کہ کیا وجہ ہے کہ قرآن کریم کی ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف میں بالکل عکسی ترتیب ہے‘ یا یوں سمجھیے کہ بالکل برعکس معاملہ ہے؟ سورۃ الفاتحہ کے بعد کی چاروں سورتیں سورۃ البقرہ‘ سورۂ آلِ عمران‘ سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ‘ قرآن کے سوا چھ پارے‘ یعنی پانچواں حصہ مدنی سورتوں پر مشتمل ہے‘ جبکہ قرآن کریم کا آخری حصہ زیادہ تر بالکل ابتدائی دور میں نازل ہونے والی مکی سورتوں پر مشتمل ہے۔ ان چار مدنی سورتوں کے فوری بعد بھی مکیات آ جائیں گی لیکن بالکل ابتدائی دور کی مکی سورتیں اختتام پر ہیں۔ گویا اس اعتبار سے ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں۔ اس کی حکمت کیا ہے؟

میرے مطالعہ کی حد تک اوّل تو اکثر و بیشتر حضرات نے اس سوال سے اعتناء ہی نہیں کیا۔ کسی نے کیا بھی ہے تو میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں آئی جسے صحیح اور قابلِ قبول توجیہہ قرار دیا جا سکے‘ سوائے اس وضاحت کے جو محمد مارماڈیوک پکتھال (۱۸۷۵ء-۱۹۳۶ء) نے کی ہے۔ انہوں نے "The Meanings of the Glorious Quran" کے نام سے قرآن حکیم کا ترجمہ کیا تھا‘ جو ایک زمانے میں کثیر تعداد میں شائع ہوا اور بہت سے اداروں کی طرف سے مفت تقسیم بھی ہوا تھا۔ جس زمانے میں دنیا میں کمیونزم کی تائید بڑھ رہی تھی‘ اور یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کے آگے بند باندھنے کے لیے کچھ مذہبی تصورات کو سامنے لایا جائے تو مغربی ممالک نے مختلف مذاہب کی مذہبی کتب کو کثرت کے ساتھ شائع کرا کے بڑی تعداد میں تقسیم کیا تھا کہ شاید کمیونزم کے اس طوفان کا مقابلہ اس روحانیت ہی کے ذریعے کیا جا سکے جو اِن مذاہب میں موجود ہے۔ اس ترجمے کا

مقدمہ میرے نزدیک بڑی ہی ذہانت پر مبنی ہے۔ مَیں نے محسوس کیا کہ مارماڈیوک پکتھال صاحب کا سیرت النبی ﷺ کے اعتبار سے بھی بڑا گہرا مطالعہ ہے کہ انہوں نے اس مقدمے میں سیرت کا جو خلاصہ بیان کیا وہ بہت جامع ہے۔ حالات وواقعات کی بہت صحیح انداز میں تعبیر کی گئی ہے۔ وہیں مجھے مذکورہ بالا سوال کا جواب بھی ملا تھا۔

انہوں نے اس کی یہ توجیہہ بیان کی ہے کہ جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا تو پہلے ایمان کی ضرورت تھی‘ اس کے بعد عمل کا معاملہ تھا۔ ابھی ایک نئی دعوت‘ نیا فلسفہ‘ نیا نظریہ‘ نئی فکر‘ نئی سوچ اور نئے عقائد کو متعارف کرانا تھا‘ تو وہاں ایمان کی اہمیت زیادہ تھی جبکہ قانون‘ احکام‘ اوامر ونواہی یعنی عمل کا معاملہ ثانوی درجہ میں تھا۔ البتہ جب اسلام نظام کی شکل میں عملاً قائم ہو گیا تو اب صورت برعکس ہو گئی۔ جب آئندہ نسلیں پیدائشی طور پر مسلمان ہوں گی تو ان کو اوّلاً عمل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ بچہ جب پانچ سات برس کا ہو جاتا ہے تو اسے نماز پڑھائی جاتی ہے‘ نو دس برس کا ہو جائے تو روزہ رکھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ چونکہ ایک تمدن‘ تہذیب‘ کلچر‘ ایک نظام ہے جو اسلام کی بنیاد پر قائم ہو چکا‘ لہٰذا اب بنسبت ایمان کے احکام کی اہمیت زیادہ ہو گئی۔ ایمان تو گویا موروثی طور پر بھی لوگوں کو مل جاتا ہے‘ البتہ جیسے جیسے انسان کا شعور ترقی کرتا ہے پھر وہ اس کا ادراک کرتا ہے‘ اس کے حقائق کو اپنے باطن کے اندر realize کر کے عملی جامہ پہناتا ہے۔ بنیادی طور پر اس معاشرے میں پیدا ہونے والے لوگوں کا ایمان کے حقائق کو ماننے اور تسلیم کرنے کا معاملہ گویا ازخود ہو جائے گا۔ اس اعتبار سے اب ترتیب یہ ہونی چاہیے کہ پہلے انہیں احکام و اعمال‘ اوامر ونواہی سے متعارف کرا دیا جائے‘ جبکہ ایمان کے مباحث بعد میں ان کے سامنے لائے جائیں۔ اسی وجہ سے مصحف میں ترتیبِ نزولی کے برعکس صورت اختیار کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے مَیں یہ عرض کر رہا ہوں کہ چونکہ مصحف کے آغاز میں اصلاً مدنی سورتیں شروع ہو رہی ہیں‘ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ مکی قرآن مجید کا خلاصہ یہاں درج کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ ایک حکیمانہ ترتیب ہے۔

مولانا اصلاحی کا موقف: تاویل خاص کے اعتبار سے ایک خیال مولانا امین احسن

اصلاحی صاحب نے ظاہر کیا ہے کہ ان دو رکوعوں میں بھی بالواسطہ روئے سخن یہود کی طرف ہے۔ چوتھے رکوع میں یہ بات کچھ نکھر کر مزید واضح ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اس میں ابلیس کا کردار سامنے آتا ہے اور ابلیسیت کی اساس ہے تکبر‘ عُجب‘ اپنے بڑے ہونے کا گھمنڈ (اَبٰی وَاسۡتَکۡبَرَ)۔ اس اعتبار سے گویا یہود کو آئینہ دکھایا جا رہا ہے کہ آج جو تم محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں استکبار کر رہے ہو‘ اپنے آپ کو ان سے بالاتر سمجھتے ہوئے ان کی دعوت کو ردّ کر رہے ہو‘ تو درحقیقت یہ شیطنت ہے۔ یہ وہی کردار ہے جو ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلے میں اختیار کیا تھا‘ اور آج تم حضرت محمد ﷺ کے مقابلے میں اختیار کر رہے ہو۔ یہ بات تو خاصی مربوط معلوم ہوتی ہے‘ البتہ تیسرے رکوع کے بارے میں مولانا اصلاحی صاحب نے یہ بات کہی ہے کہ ہجرت سے قبل تک یہود یہ سمجھتے تھے کہ (حضرت) محمد (ﷺ) کی دعوت دُور کا معاملہ ہے۔ اس دعوت سے وہاں جو ایک مسئلہ پیدا ہوا ہے اسے مکہ والے جانیں‘ ہم سے اس کا براہِ راست کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن جب حضور اکرم ﷺ مدینہ تشریف لے آئے اور یہود سے براہِ راست خطاب شروع ہوا تو اب انہیں احساس ہوا کہ یہ ہمارے لیے ایک بالقوۃ خطرہ (potential danger) ہے۔ یہ ہماری قیادت‘ سیادت‘ چودھراہٹ اور مسند کے لیے ایک خطرہ ہے۔

اس اعتبار سے انہوں نے نہ صرف مدینہ میں براہِ راست نبی اکرم ﷺ کی شدید مخالفت اختیار کی‘ بلکہ ریشہ دوانیاں اور سازشی کردار ادا کرنا بھی شروع کر دیا۔ بنی اسماعیل یعنی مکہ والوں کو بھی ورغلانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح وہاں سے بھی اس دعوت کے قدم آگے بڑھنے نہ پائیں۔ جتنا کچھ بھی وہاں ہو چکا‘ سو ہو چکا‘ اور وہاں سے ہجرت کر کے جتنے لوگ بھی آ گئے ہیں‘ سو آ گئے‘ لیکن اب وہاں بھی اس دعوت کا سدِّباب کیا جائے۔ مولانا اصلاحی صاحب کا موقف یہ ہے کہ اس رکوع میں بظاہر تو یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ کہا جا رہا ہے لیکن حقیقت میں یہ خطاب بنی اسماعیل سے ہے۔ ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ یہود کی ریشہ دوانی سے اثر پذیر نہ ہوں اور اصل حقیقت کو کھلے دل اور ذہن کے ساتھ قبول کریں‘

اسی میں تمہارے لیے خیر اور بھلائی ہے۔ یہود تمہیں ورغلانے کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں وہ تکبّر اور حسد کی بنیاد پر ہے۔

اگر ہم ان دو رکوعوں کو بھی ایک خاص سیاق وسباق (context) میں' سورۃ البقرہ کے نصف اوّل کے حوالے سے دیکھیں کہ جس میں روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہے تو یہ بات کچھ وزنی معلوم ہوتی ہے' اگرچہ میرے نزدیک اس تاویل میں تکلّف کا انداز زیادہ ہے۔ زیادہ صحیح بات وہی ہے کہ ان دو رکوعوں کو تاویلِ عام ہی کے حوالے سے ذہن میں رکھا جائے کہ چونکہ اب مسلسل چار طویل مدنی سورتیں چلنی ہیں جن میں احکام اور اوامر ونواہی آئیں گے' لہٰذا شروع میں مکی قرآن کی دعوت اور حکمت کا خلاصہ ان دو رکوعوں میں بیان کر دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ تیسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ایک طرف قرآن کی دعوت کا جوہر' اس کا لُبِ لُباب اور خلاصہ آ گیا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے اساسی نظریات یعنی توحید' معاد (آخرت) اور رسالت بیان ہو گئے ہیں۔ یہ تین چیزیں ہیں جن کو ہم جمع کرتے ہیں تو لفظ ''ایمان'' وجود میں آتا ہے' جو اسلام کا اساسی نظریہ اور جڑ بنیاد ہے۔ الغرض وہ مضامین جو بڑی تفصیل' تشریح اور شرح وبسط کے ساتھ مکی سورتوں میں آئے ہیں یہاں ان پانچ آیات میں بڑی خوب صورتی اور جامعیت کے ساتھ ان کا ایک خلاصہ آ گیا ہے۔ اس تمہیدی گفتگو کے بعد اب مطالعہ شروع کرتے ہیں:

آیت ۲۱ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾ ''اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس ربّ (مالک) کی جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے پہلے جتنے لوگ گزرے ہیں (انہیں بھی پیدا کیا) تاکہ تم بچ سکو۔''

عبادتِ ربّ کی آفاقی دعوت

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ''اے لوگو!'' [لفظ ''ناس'' کے بارے میں لغوی بحث تفصیلاً

عرض کی جا چکی ہے۔] یہاں پوری نوعِ انسانی سے خطاب ہو رہا ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب کے نزدیک تو تاویلِ خاص کے اعتبار سے یہاں بنی اسماعیل مراد ہیں' لیکن میرے نزدیک یہ خطابِ عام ہے' جو قرآن مجید کی ابدی دعوت کا بنیادی خلاصہ ہے۔ اس دعوت کا مخاطب کوئی قبیلہ یا قوم نہیں ہے' کسی ایک علاقے یا کسی خاص نسل سے متعلق لوگ نہیں ہیں' بلکہ پوری نسلِ انسانی مخاطب ہے۔ اسی لیے فرمایا: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اے بنی آدم' اے نوعِ انسانی' اے لوگو' اے انسانو!

یہ بات بہت اہم ہے کہ دونوں اعتبارات سے جب تقابل کریں گے تو قرآن کریم اور اسلام کی یہ دعوت اُن دعوتوں سے منفرد نظر آئے گی جو دنیا میں نظر آتی ہیں۔ دُنیا میں مختلف دعوتی تحریکیں موجود ہیں۔ مختلف نظام ہیں' مختلف فکر ہیں' مختلف نظریات ہیں' ان کی طرف بلانے والے موجود ہیں۔ اب ایک طرف انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت اور دوسری طرف دنیا میں تمدنی قسم کی جو دعوتیں اُٹھتی رہی ہیں' ان کا تقابل کر لیجیے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا معاملہ بھی یہ ہے کہ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ سے قبل ہر نبی کی دعوت صرف اپنی قوم کے لیے تھی۔ قرآن حکیم میں ایک ایک رسول کا نام لے کر اس کی دعوت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو' اُس کے سوا تمہارا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔'' کہیں بھی يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ کے الفاظ نہیں ملیں گے۔ یہ پہلی اور آخری دعوت ہے کہ جس میں خطابِ عام ہے۔ لوگوں سے بحیثیتِ انسان خطاب ہے' کسی قوم اور نسل سے نہیں۔ کسی ملک سے نہیں' کسی خاص علاقے سے نہیں' کسی خاص طبقے سے نہیں۔

سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے صرف حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہ گمان ہوسکتا ہے کہ ان کی دعوت بھی آفاقی اور بین الاقوامی ہو گئی۔ ملکوں' علاقوں اور نسلوں سے آگے پھیل گئی۔ درحقیقت سینٹ پال نے حضرت مسیحؑ کی تعلیمات میں جو ترامیم کی ہیں' یہ اس کا مظہر ہے' ورنہ قرآن مجید نے تو حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں صراحت کے ساتھ کہا ہے: ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۬ۙ﴾ (آل عمران:۴۹) کہ وہ رسول تھے بنی اسرائیل

کی طرف۔ اسی طرح بائبل میں حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے الفاظ اب بھی جوں کے توں موجود ہیں: ’’مَیں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں۔‘‘ ایک اور جگہ‘ انداز تو ذرا نامناسب سا معلوم ہوتا ہے‘ حضرت مسیحؑ کے الفاظ کچھ اور ہوں گے لیکن شاید کوئی ردّوبدل ہوگیا ہو۔ جب آپ اپنے شاگردوں کو تبلیغ کے لیے بھیج رہے تھے تو انہیں جو ہدایات دی ہیں ان پر مشتمل بڑا طویل وعظ بائبل کے اندر موجود ہے۔ اس میں یہ بھی ہے: ’’دیکھو! کوئی شخص اپنے بچوں کے حصے کی روٹی کتّوں کے آگے نہیں ڈالا کرتا۔ میرے پاس ایک پیغام ہے جو صرف بنی اسرائیل کے لیے ہے۔‘‘ ان الفاظ میں یہود کا گوئمز (goyims) اور جینٹائلز (gentiles) والا تصوّر جھلکتا ہے کہ درحقیقت کامل انسان تو صرف ہم ہی ہیں‘ باقی تو انسان نما حیوان ہیں جو ہم سے کم تر ہیں۔ بظاہر انسان ہیں‘ حقیقتاً نہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہی ذہنیت یہاں بھی آ گئی ہے۔ حضرت مسیحؑ نے صرف یہ کہا ہوگا کہ تمہاری ذمہ داری صرف بنی اسرائیل تک دعوت پہنچا دینے کی ہے‘ لیکن یہاں اس کے مرتب کرنے والے کی اپنی ذہنیت بھی شامل ہوئی ہے کہ ’’کوئی شخص اپنے بچوں کے حصے کی روٹی کُتّوں کے آگے نہیں ڈالتا۔‘‘

بہرحال قرآن مجید اور بائبل دونوں اس پر متفق ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت بھی صرف ایک قوم اور ایک نسل یعنی بنی اسرائیل کی طرف تھی۔ صرف محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ یہی بات سورۂ سبا میں واضح الفاظ میں کہی گئی:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّ نَذِيۡرًا وَّلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸﴾﴾

’’اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر تمام بنی نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔‘‘

چنانچہ سابقہ انبیاء و رسل علیہم السلام کی دعوت میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں ہے کہ پوری نوعِ انسانی سے خطاب ہوا ہو۔

بعثتِ محمدیؐ کی اِتمامی و تکمیلی شان

مَیں نے اپنی کتاب ’’نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مقصدِ بعثت‘‘ میں اس پر تفصیلاً بحث کی ہے کہ ایک بنیادی تصورِ رسالت و نبوت ہے اور ایک تکمیلِ رسالت کا مرحلہ ہے جو محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو طے کرایا گیا۔ اس ضمن میں مقصدِ رسالت اور تکمیلِ رسالت میں جو بنیادی فرق و امتیاز ہے‘ اس اعتبار سے مَیں نے یہ باتیں بیان کی ہیں کہ اس کا تعلق انسان کی تمدنی ترقی‘ خاص طور پر سائنسی ترقی کے ساتھ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت سے قبل عملی اعتبار سے یہ ناممکن تھا کہ ایک دعوت پوری نوعِ انسانی کو پہنچائی جا سکے۔ ابھی رسل و رسائل اور اطلاعات و نشریات کے ذرائع اتنے تھے ہی نہیں۔ انسان ایک دوسرے سے اجنبیت لیے ہوئے دُور دُور مختلف علاقوں میں آباد ہو رہے تھے۔ ان کے درمیان فاصلے تھے۔ رابطے نہیں تھے‘ ذرائع مواصلات نہیں تھے۔ چنانچہ فزیکل اعتبار سے یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے پہلے جتنی نبوتیں آئیں وہ سب مختلف اقوام کے لیے تھیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ﴿۷﴾﴾ (الرعد) ’’اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی تھا۔‘‘ اور: ﴿وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ ﴿۲۴﴾﴾ (فاطر) ’’اور کوئی اُمّت ایسی نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ گزرا ہو۔‘‘ البتہ کسی بھی نبی کی دعوت اس طرح کی آفاقی نہیں تھی جس میں پوری نوعِ انسانی کو خطاب کیا جا رہا ہو۔ یہ خاصّہ ہے دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اور دعوتِ قرآنی کا!

اسی طرح یہ تقابل کیجیے کہ دنیا میں جو دوسری دعوتیں ہوتی ہیں‘ تحریکیں اٹھتی ہیں‘ وہ کسی نہ کسی طبقے کو اپنا مخاطبِ اوّلین بناتی ہیں۔ ان میں بنی آدم کو بحیثیت انسان خطاب کرنے والی کوئی دعوت نہیں۔ چنانچہ ملک کی عظمت کا نعرہ لگایا جاتا ہے‘ قوم کی برتری اور قوم کی عزّت کے حوالے سے لوگوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آؤ اور جمع ہو جاؤ۔ اپنی عزت‘ وجاہت‘ حیثیت اور وقار کا دفاع کرو! بین الاقوامی سطح پر اگر کوئی دعوت اٹھی تھی تو وہ کمیونزم تھا‘ لیکن اس میں بھی طبقاتی تقسیم تھی۔ اس کا نعرہ تھا: ’’دنیا بھر کے مزدورو جمع ہو جاؤ!‘‘ ساری اپیل محنت کش طبقہ کے لیے جبکہ مِل مالکان اور کارخانہ داروں کے خلاف تھی۔ گویا

ایک طبقاتی دشمنی اور نفرت پیدا کرنا مقصود تھا۔ عوام الناس سے کوئی تخاطب نہیں تھا‘ ان کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ یہ دعوت صرف محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ہے کہ اس میں کسی طبقہ‘ قوم‘ نسل‘ علاقے سے خطاب نہیں‘ بلکہ پوری نوعِ انسانی سے اس کی ذاتی حیثیت میں مخاطبت ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ۔ دعوت کیا ہے؟ اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ ’’اپنے ربّ کی عبادت کرو!‘‘

دعوتِ قرآنی کا نقطۂ آغاز

یہ دونوں الفاظ (عبادت اور ربّ) سورۃ الفاتحہ میں آچکے ہیں اور وہاں ان کی لُغوی بحث بھی تفصیل کے ساتھ آچکی ہے۔ اس وقت چند چیزیں دوبارہ ذہن میں مستحضر کر لی جائیں۔ اوّل تو یہ کہ یہاں پہلی مرتبہ قرآن کی دعوت آرہی ہے۔ ترتیبِ مصحف میں پہلے سورۃ الفاتحہ ہے لیکن اس کے اندر دعوت کا انداز نہیں ہے کہ ایمان لاؤ‘ یا یہ مانو‘ یہ کرو‘ یا یہ نہ کرو‘ بلکہ اُس میں ایک تو اعتراف ہے۔ ایک سلیم العقل اور سلیم الفطرت انسان جہاں تک خود پہنچ گیا ہے اس کا وہ اظہار کر رہا ہے اور پھر ایک دعا‘ ایک استدعا کر رہا ہے: ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝﴾۔ سورۃ البقرۃ کے دو رکوع بھی انشائیہ کلام نہیں ہیں کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو‘ بلکہ سارا خبریہ کلام ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں‘ کچھ لوگ ایسے ہیں‘ اِن کا انجام یہ ہے‘ اُن کا انجام یہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ پہلا مقام آرہا ہے جہاں کلام انشائیہ ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ﴾ ’’اے لوگو! بندگی کرو‘ پرستش کرو اپنے رب کی۔‘‘ اس پہلو سے اگر قرآن کریم کی دعوت کو معیّن کیا جائے کہ وہ کیا ہے‘ تو اس کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔ اس اعتبار سے سورۂ ہود کی ابتدائی آیات ذہن میں رہنی چاہئیں:

﴿الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۝۱﴾

’’ا‘ ل‘ ر۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات (پہلے) پختہ کی گئی ہیں‘ پھر ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے اُس ہستی کی طرف سے جو حکیم اور خبیر ہے۔‘‘

اور کس لیے نازل ہوئیں: ﴿اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ﴾ ’’کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی مت کرو!‘‘ چنانچہ ایک ہی بات بیان ہوئی۔ یہاں مثبت اسلوب میں: ﴿اعْبُدُوْا

رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ﴾ (البقرۃ) جب کہ وہاں ﴿اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ﴾ کے الفاظ میں کہ مت بندگی کرو اللہ کے سوا کسی کی۔ یہ گویا اسی کا منفی اسلوب ہے۔

مزید یہ کہ مکی سورتوں میں تفصیل سے تمام رسولوں کا تذکرہ آیا ہے کہ حضرت نوح‘ حضرت ہود‘ حضرت صالح اور حضرت لوط علیہم السلام کی دعوت کیا تھی! سورۃ الاعراف‘ سورۂ ہود اور سورۃ الشعراء میں جہاں ترتیب کے ساتھ انباء الرسل بیان ہوئے ہیں‘ وہاں دعوت کے دو اسلوب ملیں گے۔ ایک: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ﴾ ’’یہ کہ اللہ کی بندگی کرو‘ تمہارا اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔‘‘ اور دوسرا: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ﴾ ’’پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!‘‘ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت بایں الفاظ نقل ہوئی: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاتَّقُوْہُ وَاَطِیْعُوْنِ ۝۳﴾ (نوح) ’’یہ کہ تم لوگ اللہ کی بندگی کرو‘ اُس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔‘‘ گویا دعوتِ توحید کے ساتھ رسالت کو قبول کرنا بھی لازم ہے‘ اس کے بغیر بات مکمل نہیں ہوگی۔ ہر رسول کی دعوت یہ تھی کہ مَیں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں‘ لہٰذا اُس کی پرستش اور بندگی ہوگی میری اطاعت کے ذریعہ سے۔

پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ بات کہ قرآن حکیم کی رو سے جنوں اور انسانوں کا مقصد تخلیق ہی ’’عبادتِ ربّ‘‘ ہے۔ سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ ’’اور مَیں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔‘‘ لفظ عبادت کا لُغوی مفہوم قبل ازیں بیان ہو چکا ہے۔ صرف یہ بات ذہن میں تازہ کر لیں کہ عربوں کے ہاں یہ لفظ تذلّل کے لیے استعمال ہوتا تھا‘ یعنی کسی کے سامنے بچھ جانا‘ کسی کا مطیع فرمان بن جانا۔ چنانچہ جو اونٹ پوری طرح سدھا لیا جائے کہ اس پر سواری کی جا سکے اسے ’’اَلْبَعِیْرُ الْمُعَبَّد‘‘ کہتے ہیں‘ اس لیے کہ اب وہ آپ کا حکم مانتا ہے‘ آپ کے اشاروں پر حرکت کرتا ہے۔ وہ گھٹنے کی ذرا سی ایڑ سے سمجھ جاتا ہے کہ میرا سوار چاہتا ہے کہ مَیں تیز دوڑوں‘ لگام کے ذرا سے اشارے کو سمجھتا ہے کہ اب مَیں رُک جاؤں۔ یہ تمام باتیں جانور کے ’’مُعَبَّد‘‘ ہونے کی علامات ہیں‘ گویا

وہ پوری طرح مطیع ہو گیا ہے۔ اسی طرح وہ راستہ جو لوگوں کے مسلسل چلتے رہنے سے دب جاتا ہے‘ قدموں تلے پامال ہو جاتا ہے‘ مٹی بیٹھ جاتی ہے اور اس اعتبار سے اس کے اندر ہمواری آ چکی ہوتی ہے‘ کوئی اونچ نیچ نہیں رہتی تو یہ پامال شدہ راستہ ’’اَلطَّرِیْقُ الْمُعَبَّد‘‘ کہلاتا ہے۔

جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام فرعون کے دربار میں آئے اور دعوت پیش کی تو اُس نے بڑے استحقار کے انداز میں یہ پھبتی چست کی تھی: ﴿وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿٤٧﴾﴾ (المؤمنون) ’’ان کی قوم تو ہماری عابد ہے۔‘‘ ہماری مطیع ہے‘ ہماری غلام ہے‘ ہمارے سامنے ذلیل وخوار ہے اور ہمارے زیرِ فرمان ہے۔ ان کو کیسے جرأت ہوئی کہ وہ ہمیں کوئی پیغام دینے یا ہم سے کوئی تقاضا اور مطالبہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ فرعون کے ساتھ مکالمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی لفظ استعمال کیا۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ طعنہ بھی دیا تھا: ﴿اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا﴾ (الشعراء:١٨) ’’کیا ہم نے ہی اپنے ہاں تمہیں پالا پوسا نہ تھا جب کہ تم چھوٹے سے تھے؟‘‘ ہمارے ہاں پل کر گویا ’’ہماری بلی اور ہم سے ہی میاؤں!‘‘ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿٢٢﴾﴾ (الشعراء)

’’اور یہ وہ احسان ہے جو تم مجھے جتلا رہے ہو جس کے عوض تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے!‘‘

تم نے جو بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا لیا ہے‘ انہیں جکڑ لیا ہے‘ ماتحت اور زیرِ نگیں کیا ہوا ہے‘ تم اس کو تو بھول گئے ہو‘ اور میں تمہارے محل میں پلا بڑھا ہوں تو مجھ پر وہ احسان جتا رہے ہو!

عبادت: کامل اطاعت اور محبّت کا امتزاج

لفظ ’’عبادت‘‘ کا اصل مفہوم ’’تذلّل‘‘ ہے۔ تقریباً تمام جمہور علماء لغت کا فیصلہ یہ ہے کہ: العبادة التذلل یعنی بچھ جانا‘ گر جانا‘ عاجزی وانکساری اختیار کرنا‘ اپنی انانیت کو ختم کر دینا‘ اپنی مرضی سے دست بردار ہو جانا‘ یہی عبادت ہے۔ البتہ اس کے اندر محبّت کی اصل روح جب پیدا ہو گی تو یہ دینی اعتبار سے عبادت ہو گی۔ خالص سیاسی تصور کے

اعتبار سے عبادت صرف غلامی ہے۔ اگر بنی اسرائیل فرعون کی اطاعت کر رہے تھے تو ایسا اُس کی محبت یا اپنے دل سے اُس کی تعظیم کرنے کی بنا پر نہیں تھا‘ بلکہ یہ ان کی مجبوری تھی‘ جیسے ہم انگریز کی اطاعت کرنے پر مجبور رہے۔ ہم اُس کے غلام تھے‘ اُس نے ہمیں فتح کیا‘ وہ ہمارا حاکم تھا۔ البتہ اطاعت کے ساتھ جب محبت کی چاشنی شامل ہو جائے‘ کسی کی محبّت اور عظمت کا نقش قلب پر اتنا گہرا ہو جائے کہ انسان دلی آمادگی کے ساتھ خود اُس کی اطاعت اختیار کرے‘ اُس کے سامنے اپنے آپ کو بچھا دے تو یہ اصل عبادت ہے جو مطلوب ہے۔ یہاں ’’عبادتِ ربّ‘‘ کی دعوت اسی معنی میں ہے: اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ’’اپنے ربّ کی بندگی اور پرستش کرو‘‘۔ شیخ سعدیؒ نے کہا ہے ؎

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی!

بندگی محض اطاعت اور غلامی ہے‘ جب کہ پرستش کے اندر کسی کی محبت ہوتی ہے‘ کسی کی عظمت کا نقش ہوتا ہے‘ کسی سے والہانہ عشق ہوتا ہے‘ کسی کی احسان مندی کا جذبہ ہوتا ہے۔

اصل میں جذبۂ شکر ہی عبادت کے جذبے کی شکل اختیار کرتا ہے‘ اس لیے کہ فطرتِ انسانی کی صحت کی ایک علامت یہ ہے کہ اس میں شکر کا جذبہ ہو‘ شکر کا مادّہ ہو۔ اگر کوئی اس کے ساتھ بھلائی کرے‘ خیر کرے‘ اُس کی کسی ضرورت کو پورا کرے تو اس کی احسان مندی کے جذبات پیدا ہونے چاہئیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ صحتِ فطرت کی علامت ہے‘ اور اگر نہ ہو تو گویا فطرت مسخ (pervert) ہو چکی ہے‘ اس کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ اسی فطرت کا ایک تقاضا یہ ہے کہ جس نے آپ کے ساتھ بھلائی کی ہے‘ آپ بھی اس کے ساتھ کوئی بھلائی کریں‘ کسی درجہ میں اُس کو جزا دیں۔ کسی انداز میں اس کی کوئی خدمت کریں۔ والدین نے آپ کے ساتھ بھلائی کی ہے‘ آپ بھی ان کی خدمت کریں۔ کسی پڑوسی نے کبھی آپ کے ساتھ کوئی بھلا کام کیا ہے تو آپ بھی تلاش میں رہیں کہ کوئی موقع ملے تو میں اس کے احسان کا بدلہ چکا دوں: ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿٦٠﴾﴾ (الرحمٰن) ’’احسان کا بدلہ تو احسان ہی ہو سکتا ہے۔‘‘ یہ بھی فطرت کا تقاضا ہے۔

چنانچہ اگر کوئی ایسا محسن ہے کہ جس کے احسان کا آپ کچھ بدلہ دے سکیں تو ٹھیک ہے۔ عوضِ معاوضہ گلہ ندارد۔ آپ نے احسان کا بدلہ چکا دیا' اب آپ کے اعصاب پر کوئی بوجھ نہیں رہا کہ مَیں اس کا احسان منداور اس کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں۔ البتہ اگر کوئی ہستی اتنی بلند ہے کہ آپ تو اُس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے' جیسے سورج کہ اس کی تمازت سے فصلیں پک رہی ہیں' ہواؤں کا نظام قائم ہے' بارشیں برس رہی ہیں' ہمارے بڑے کام چل رہے ہیں' لیکن ہم اس کی کیا خدمت بجالائیں' اس کو کیا بدلہ دیں؟ اگر انسان سورج کے خالق اور اُس کی قدرت سے ناواقف ہو تو پھر اس کے لیے تو بس یہی رہ گیا کہ سورج کو دیوتا مان کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاؤ' اس کی عظمت کا اقرار کرو' اس کے گُن گاؤ' اس کی کچھ مدح وستائش کرو' اس کے آگے سر جھکا دو' سجدہ کرو' ڈنڈوت کرو! اس اعتبار سے یہ جذبۂ شکر درحقیقت پھر جذبۂ عبادت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ ایسا جذبۂ عبادت درحقیقت مطلوب ہے اللہ تعالیٰ کے لیے کہ انسان یہ پہچان لے کہ ربّ حقیقت میں وہی ہے۔ میری ربوبیت چاہے کتنے مختلف گوشوں سے ہو رہی ہے' میری ضروریات کی بہم رسانی کا نامعلوم کتنا طویل نظام ہے' لیکن دراصل میرا ربّ ایک ہی ہے۔ ربوبیت کے یہ سارے سلسلے اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جس نے اس حقیقت کو پہچان لیا اس کی ساری عبادت' پرستش اور بندگی کا جذبہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے وابستہ ہو جائے گا۔ سورۃ الفاتحہ میں یہ سارے مضامین آچکے ہیں۔

محبت اور اطاعت دونوں میں نسبت معلوم کرنے کے لیے بہترین تشبیہ یہ ہے کہ جیسے ہمارے جسم کے اندر جان ہے۔ جان نظر نہیں آتی' اس کا وزن ہمیں معلوم نہیں' لیکن جسم کی حیات اسی کی بدولت ہے۔ جان نکل جائے تو جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار (disintegrate) ہو جائے گا' متعفّن ہو جائے گا۔ چنانچہ جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ جسم ہے' لیکن اس کی حقیقت جان سے ہے۔ جان سے بھی آگے جائیے تو جسم کے اندر روح ہے' لیکن نظر آنے والی چیز جسم ہی ہے۔ اسی طرح عبادت کا پیکر' جو نظر آتا ہے وہ تو ہے اطاعت۔ ہمہ تن' ہمہ وقت' ہمہ جہت' ہر اعتبار سے اللہ کی اطاعت' لیکن اس کی اصل روح اور جان محبت ہے۔ اگر

محبت موجود ہے تو یہ اطاعت پھر عبادت بن جائے گی۔ اگر محبت نہیں ہے تو نری اطاعت ہی رہ جائے گی۔ ایسی اطاعت تو جبری بھی ہوتی ہے' مجبوراً بھی ہوتی ہے' دکھاوے اور ریاکاری کے لیے بھی ہوتی ہے۔ وہ پھر عبادت شمار نہیں ہو گی جب تک کہ محبت کی روح اور اصل جان اس کے اندر سرایت کیے ہوئے نہ ہو۔

اس حقیقت کو امام ابن تیمیہؒ نے بھی خوب صورت الفاظ میں بیان کیا ہے: ''اَلْعُبُوْدِیَّۃُ یَتَضَمَّنُ کَمَالَ الذُّلِّ وَکَمَالَ الْحُبِّ'' یعنی عبودیت کا لفظ دو چیزوں کو جمع کر دیتا ہے: آخری درجہ کا تذلّل' انکساری' اور اس کے ساتھ حد درجہ کی محبت۔ دونوں چیزیں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوں تو لفظ عبودیت کا تقاضا پورا ہوگا۔ ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیمؒ جن پر کچھ متصوفانہ رنگ غالب ہے' انہوں نے اس کی ترتیب بدل دی اور وہ محبت کو پہلے لا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ''اَلْعِبَادَۃُ تَجْمَعُ اثْنَیْنِ: غَایَۃَ الْحُبِّ مَعَ غَایَۃَ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ'' یعنی عبادت دو اساسات (بنیادوں) کو جمع کرتی ہے: اللہ تعالیٰ سے انتہا درجہ کی محبت' اور اس کے ساتھ حد درجہ کی عاجزی وانکساری۔ عبادت کے لیے یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں۔

دورِ زوال میں محدود تصورِ عبادت

اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ عبادت اور عبادات کا اصل تعلق کیا ہے! بدقسمتی سے ہمارے دورِ زوال میں تصورِ عبادت محدود ہوتا چلا گیا اور محض ''عبادات'' تک رہ گیا' یعنی نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ جو مراسمِ عبودیت (modes of worship) ہیں' جو معیّن افعال ہم پر فرض کیے گئے ہیں۔ ان کو رسم کہا جائے تو کوئی حرج نہیں' کیونکہ رسم کا لفظی معنی کسی چیز کی ظاہری صورت ہوتا ہے' جیسے رسم الخط' جس کے ذریعے ہم حروف کو ظاہر کرتے ہیں۔ تاہم اگر انسان کی نگاہ صرف رسم ہی پر جم جائے' جسے رسم پرستی (ritualism) کہتے ہیں تو یہ طرزِ فکر یقیناً غلط ہے۔ البتہ بقول مرزا غالب: ع ''لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی!'' ہر لطیف حقیقت کو اپنے ظہور کے لیے کسی نہ کسی کثیف واسطے (medium) کی ضرورت ہوتی ہے' جس کے بغیر اس کی حقیقت سامنے نہیں آ سکتی۔ اسی لیے عبادت کا

جذبہ اپنے ظہور کے لیے کسی نہ کسی رسم کا محتاج ہے۔ ہمارے صدیوں کے زوال کے نتیجے میں دین نے جب مذہب کی شکل اختیار کر لی تو پھر عبادت کا تصور محدود ہو کر انہی مراسمِ عبودیت تک رہ گیا۔ ؎

رہ گئی رسمِ اذاں، رُوحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی!

بحمد اللہ! ہمارے اس دور میں بہت سے اہلِ قلم حضرات، مصنّفین اور مفکّرین سامنے آئے ہیں، جن کی اجتماعی جِدّوجُہد کے نتیجے میں اب یہ حقیقت واشگاف ہو چکی ہے کہ عبادت سے مراد پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے۔ یہ اس کا ایک لازمی حصہ ہے، وگرنہ تو درحقیقت ایک تناقض ہے۔ ایک تضاد یہ ہے کہ ہم نماز میں تو اللہ کی بندگی کر رہے ہوں لیکن جب نماز سے فارغ ہو جائیں تو اپنی مَن مانی، اپنی نفس پرستی، اپنے معاشرے کا جو چلن ہے یا جو بھی سِکّہ رواں ہے، اس کی پیروی شروع کر دیں، تو یہ ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲﴾ (الصف) ہے۔ ہم آہنگی اسی صورت میں ہو گی کہ ہماری زندگی کا بالکل ایک ہی رنگ ہو۔ یوں سمجھیے کہ نماز کی حالت میں وہ رنگ بہت گہرا ہے، اس لیے کہ ہمہ تن، ہمہ وجوہ اسی پر ارتکاز ہے:

﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۷۹﴾ (الانعام)

''یقیناً مَیں نے تو اپنا رُخ کر لیا ہے یکسو ہو کر اُس ہستی کی طرف جس نے آسمان و زمین کو بنایا ہے، اور مَیں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

ہر شے سے منقطع ہو کر، اپنا تعلق توڑ کر اپنی توجہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف مرتکز کیا ہے۔ گویا اس عبادت کا رنگ یہاں گہرا ہے۔ باقی یہ کہ اس کے ساتھ ہم آہنگی ہونی چاہیے، پوری زندگی اسی رنگ میں رنگی ہونی چاہیے۔ اگر پوری زندگی کا طرزِ عمل (behavior) اور سارے معاملات اس سے ہم آہنگ نہیں ہیں تو یہ تناقض ہے۔ یہی پھر منافقت کی طرف لے جانے والی شے ہے۔ اس اعتبار سے اگرچہ یہ تصوّرِ عبادت اب بہت حد تک لوگوں

کے سامنے آ چکا ہے، البتہ اس میں یہ محبت والا پہلو چونکہ سابق زمانے میں صوفیاء کا موضوع رہا ہے، لہٰذا اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ بھی ہے کہ بقول اقبال: ؎

اٹھائے کچھ وَرق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

دین کی حقیقتِ واحدہ کو مختلف اجزاء میں تقسیم کر دیا گیا، جو مختلف طبقات نے سنبھال لیے۔ وہ گویا ان کا اپنا اپنا ایک مخصوص دائرہ (exclusive domain) بن گیا۔ یعنی عشقِ حقیقی اور محبّتِ الٰہی کی بات کریں گے تو صرف صوفیاء۔ نماز، روزے اور ان کے قوانین وقواعد کی بات علماء وفقہاء کریں گے۔ ہمارے جدید دینی مفکّرین اور ان میں بھی جو دین کے داعی ہیں، پھر احیائی تحریکات میں جو لوگ سرگرم ہیں، ان سب کو عام طور پر تصوف سے ایک کد ہے، ایک بُعد ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جن کی وجہ سے ان کے فکر اور approach کے اندر روحانیت سے اس طرح کی الرجی اور دُوری پیدا ہوئی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کمی کو پورے شدّومد کے ساتھ، پورے زور (emphasis) کے ساتھ مکمل کیا جائے، اس لیے کہ جب تک محبتِ الٰہی کی چاشنی شامل نہ ہو، محض اطاعت عبادت نہیں ہے۔ اسی لیے مَیں نے حافظ ابن قیم اور امام ابن تیمیہ رحمہما اللہ، دونوں کی عبارات آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ اس ایک آیت ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۲۱﴾ پر مَیں نے ایک مکمل تقریر کی تھی جو ''میثاق'' کے اکتوبر اور نومبر ۱۹۹۱ء کے شماروں میں ''دعوتِ بندگیٔ ربّ'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ جن حضرات کو دلچسپی ہو وہ اس کا مطالعہ کریں۔

عبادت اور عبادات کا باہمی تعلق

عبادت مطلق، ہمہ وقت، ہمہ وجوہ اطاعت ہے، لیکن محبّت کے جذبہ سے سرشار ہو کر۔ اس ''عبادت'' کا ''عبادات'' کے ساتھ کیا تعلق ہے، اسے بھی اختصار کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔ یہ عبادت آسان نہیں ہے، اس میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ ہمارا نفس ہے۔ پھر یہ کہ ذہول یعنی بھول جانا، اس لیے کہ اس دنیا میں انسان کے

معاملات ہیں‘ مصروفیات ہیں‘ مشغولیات ہیں۔ اس پر ماحول کے جو مختلف اثرات پڑ رہے ہیں‘ ان سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا کہ انسان اپنے اس عہد پر کاربند رہے کہ اللہ ہی کی بندگی کرنی ہے‘ اللہ ہی کی اطاعت کرنی ہے۔ گویا بہت سے داخلی اور خارجی موانع ہیں۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

یعنی مَیں جب یہ کہتا ہوں کہ مَیں مسلمان ہوں تو مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے‘ اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ لا اِلٰہ اِلا اللہ کہہ دینا اور اللہ کی بندگی کا اقرار کر لینا بہت آسان لیکن اس پر پورا اُترنا بہت مشکل ہے۔ اس میں مختلف پہلوؤں سے جو رکاوٹیں ہیں ان کی تسہیل‘ ان کی تیسیر‘ ان کو آسان بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ چار عبادات عطا کی ہیں۔ نماز اس لیے ہے کہ مبادا آپ بھول جائیں کہ آپ اپنے ربّ کے بندے ہیں۔ جو لوگ نفلی نمازیں بھی پڑھیں ان کا معاملہ تو اور آگے کا ہے‘ لیکن فرض نمازیں پانچ ہیں۔ دن میں پانچ مرتبہ اپنی زندگی کے معمولات کو توڑ کر آؤ اور اپنے عہدِ بندگی کو تازہ کرو: ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾ بقول حفیظ جالندھری ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں‘ لوحِ جبیں تازہ کریں!

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾﴾ (طٰہٰ) ’’اور قائم رکھو نماز کو میری یاد کے لیے۔‘‘ کہیں بھول نہ جاؤ‘ وہ کیفیت نہ ہو جائے کہ ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

اس کے لیے نماز گویا کہ ستون ہے: ((اَلصَّلَاۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ)) یہ معمولات کو جکڑ دے۔ زندگی کے تمام معمولات اس کے گرد گردش (revolve) کریں۔ یہی زندگی کا اصل عمود اور مرکز و محور بن جائے۔ پھر یہ کہ نفس کے جو تقاضے ہیں‘ ان کی ڈھال کے طور پر ((اَلصَّوْمُ

جُنَّۃٌ)) (صحیح البخاری: ۷۴۹۲) کے مصداق روزہ رکھو‘ تاکہ تم نفس کے منہ زور گھوڑے کو قابو کر سکو‘ اس کو لگام دے سکو۔ وہ تم پر غالب نہ آ جائے بلکہ تم اس پر غالب رہو۔ تمہاری خودی‘ انا‘ قوتِ ارادی غالب رہے جبکہ نفس اور اس کے تقاضے مغلوب رہیں۔ اسی لیے فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾﴾

’’اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ فرض کیا گیا تھا تم سے پہلوں پر تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔‘‘

تیسری سب سے بڑی رکاوٹ مال کی محبت ہے‘ جو درحقیقت دنیا کی محبت کی علامت ہے۔ دنیا کی محبت کا خلاصہ مال کی محبت ہے اور اس کے ازالے کے لیے انفاقِ مال ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو‘ اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا کرو۔ زکوٰۃ‘ تزکیہ سے ہے اور تزکیہ کے معنی ہیں پاک کرنا۔ تمہارے دل میں اگر مال کی محبت کی نجاست لگی رہے گی تو تم عبادت کے اس تقاضے کو پورا نہیں کر سکو گے‘ لہٰذا اس نجاست کو دھوؤ‘ اپنے مال میں سے اللہ کی راہ میں دو۔ زکوٰۃ بھی عبادت ہے۔ اسلام کا ایک اہم رکن حج ہے جو شعائر اللہ میں سے ہے۔ اس میں یہ تینوں حکمتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ اس میں ذکر بھی ہے‘ تلبیہ بھی ہے۔ اس میں خرچ ہے‘ انفاق کا معاملہ ہے‘ اور پھر حالتِ احرام میں روزے سے مشابہ پابندیاں بھی ہیں۔ اس اعتبار سے اصل ’’عبادت‘‘ کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ’’عبادات‘‘ کی صورت میں ہمیں یہ اعمال عطا فرمائے ہیں۔ یہ ہمارے اصل مقصدِ زیست ﴿وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ کو پورا کرنے میں ممد و معاون ہیں۔ چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا مظہر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت کو ان ’’عبادات‘‘ سے جدا کرنے کے لیے سورۃ البیّنۃ کی یہ آیت ضرور ذہن میں رہنی چاہیے کہ دونوں کے درمیان میں واوِ عطف آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ مَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ۬ حُنَفَآءَ﴾

''اور انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا مگر اس کا کہ اللہ ہی کی بندگی کریں‘ اطاعت کو اُس کے لیے خالص کر کے‘ یکسو ہو کر‘‘

خالص اُسی کی بندگی کریں‘ اطاعت کو اُس کے لیے خالص کرتے ہوئے‘ حنیف ہو کر۔ کہیں بھی دوغلا پن پیدا نہ ہو۔ وہ یکسو ہوں‘ یک رنگ ہوں‘ پوری زندگی میں اللہ ہی کی عبادت ہو۔

﴿وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۵﴾

''اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ‘ اور یہی ہے دین قیم۔''

اس سے گویا ''عبادت'' اور ''عبادات'' کا اصل مفہوم واضح ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو عبادات عطا فرمائی ہیں وہ دین کی بنیادیں ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ کے بعد صوم اور پھر حج ہے‘ لیکن ان میں سے دو اہم تر ستون نماز اور زکوٰۃ کا یہاں ذکر فرمایا گیا۔

ربوبیت: تخلیق پر مقدّم کیوں؟

آیت زیرِ مطالعہ میں ارشاد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ﴾

''اے لوگو! بندگی اور پرستش اختیار کرو اپنے اس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔''

قرآن مجید میں ربوبیت کو تخلیق پر مقدّم رکھا جاتا ہے‘ حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے تخلیق ربوبیت پر مقدّم ہے۔ پہلے کسی شے کو پیدا کیا گیا ہے‘ اس کا وجود ہے۔ اب اس وجود کے لیے ترقی ہے‘ اس کے تقاضے ہیں‘ اس کی ضروریات ہیں‘ اس کی پرورش ہے۔ چنانچہ عملاً ترتیب یہ ہے۔ جیسے قرآن حکیم کی ترتیبِ مصحف اور ترتیبِ نزولی میں فرق ہے‘ جو حکمت کی بنیاد پر ہے‘ اسی طرح اگرچہ تخلیق مقدّم ہے ربوبیت پر‘ البتہ قرآن ہمیشہ ربوبیت کا ذکر تخلیق سے پہلے کرتا ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۱﴾

''پڑھو اپنے ربّ کے نام سے جس نے پیدا کیا۔''

ربّ کا نام پہلے اور خَلَقَ بعد میں آیا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ انسان کے شعوری ارتقاء کی ترتیب یہی ہے۔ مثال کے طور پر ایک چھوٹا سا بچہ ہے‘ اُسے بھی اپنی ضرورتوں کا احساس ہے۔ بھوک لگتی ہے تو روتا ہے۔ جب ماں نے دودھ پلایا تو اس کا ایک اثر‘ ایک تاثر اُس کی نفسیات پر قائم ہوگا۔ اسے ماں سے محبت اسی لیے ہے کہ اس کی ضرورت ماں سے پوری ہوئی ہے۔ ذرا اور بڑا ہوتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں سے کوئی خطرہ ہو‘ خدشہ ہو تو میرا کنبہ قبیلہ‘ میرا خاندان‘ میرے بہن بھائی‘ یہ سب میرے محافظ ہیں۔ اپنی ضروریات اور اپنے تحفظ کا یہ شعور انتہائی بنیادی چیز ہے۔ اسے اپنے وجود اور اپنی ہستی کا احساس تو اس وقت ہوگا جب وہ جوان ہوگا اور اس کا شعور اپنی پختگی کو پہنچے گا۔ پھر یہ کہ وہ تخلیق کے کس کس مرحلہ سے گزرا ہے‘ یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس اعتبار سے شعورِ انسانی کے ارتقائی عمل میں تصورِ ربوبیت مقدّم ہے۔ لہٰذا ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ﴾ میں دلیلیں بھی آ گئیں۔ وہی تمہارا ربّ ہے جو تمہارا خالق ہے۔ ع ''وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق!'' اُس کے علاوہ تم کسی اور کی بندگی کرتے ہو تو وہ نہ تمہارا ربّ ہے اور نہ تمہارا خالق۔ اپنے نفس کی بندگی کرو گے تو وہ نہ تمہارا خالق ہے نہ تمہارا ربّ۔ اپنے والدین کی بندگی کرو گے تو وہ تمہارے خالق نہیں۔ کسے باشد! اس اعتبار سے ان دونوں الفاظ میں بہت بڑی دلیل مضمر ہے۔

آباء پرستی کی نفی

آگے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ''اور اُن کو بھی (پیدا کیا) جو تم سے پہلے تھے۔'' یہ بات یہاں خاص طور پر کیوں لائی گئی؟ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے‘ واللہ اعلم‘ کہ انسان کی ایک بہت بڑی گمراہی یہ رہی ہے کہ آباء و اَجداد کے جو بھی طور طریقے چلے آ رہے ہوں ان کے ساتھ ایک عصبیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم انہیں کیسے چھوڑ دیں! یہ ہمارے قبیلے کی ریت ہے۔ ان بُتوں کو پوجنا ہماری خاندانی روایات ہیں۔ اس طرح جو ایک تقدس پیدا ہو جاتا ہے‘ جسے آباء پرستی کہا جا سکتا ہے‘ یہ بات بھی ایک دلیل کی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ ہمارے ہاں تو یہ بات اسلاف سے چلی آ رہی ہے۔ یہاں درحقیقت

اس کی جڑ کاٹی جارہی ہے کہ وہ بھی مخلوق تھے جیسے تم مخلوق ہو۔ جیسے تمہیں اللہ نے پیدا کیا' ویسے ہی انہیں بھی پیدا کیا تھا' لہٰذا ان کا کوئی فعل تمہارے لیے سند اور دلیل نہیں۔ یہی بات ہے جو مکّی سورتوں میں' خاص طور پر سورۂ لقمان میں بڑی وضاحت کے ساتھ آئی ہے کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک فطرت کا تقاضا ہے:

﴿وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ‌ۚ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِـوَالِدَيۡكَ ؕ اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ ۝۱۴﴾ (لقمان)

''اور ہم نے وصیت کی انسان کو اُس کے والدین کے بارے میں۔ اُس کو اُٹھائے رکھا اُس کی ماں نے (اپنے پیٹ میں) کمزوری پر کمزوری جھیل کر' اور اُس کا دودھ چھڑانا ہوا دو سال میں' کہ تم شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا! اور میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہوگا۔''

یہ تو فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ شکر کا بدلہ ہونا چاہیے۔ انہوں نے تمہیں پالا پوسا' خاص طور پر ماں' جو تمہاری پیدائش اور شیرخوری کے کٹھن مراحل سے گزری۔ اس اعتبار سے ان کے ساتھ احسان' حسنِ سلوک تو ایک قدرتی امر ہے ___ لیکن:

﴿وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ۙ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَصَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ‌ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝۱۵﴾

''اور اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ شریک کرو اُس چیز کو جس کا تمہارے پاس کوئی علم نہیں تو اُن کا کہنا مت مانو' اور دنیا میں اُن کے ساتھ رہو بہتر انداز میں' اور پیروی کرو اُس شخص کی جو میری طرف رخ کر چکا ہے۔ پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے' پھر مَیں تمہیں جتلا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

اگر وہ شرک اور کفر کا حکم دیں' غلط بات کی تلقین کریں' حرام پر آمادہ کرنا چاہیں تو اُن کا کہنا مت مانو' یہ اُن کا حق نہیں ہے۔ گویا والدین کا اتباع ضروری نہیں۔ اطاعتِ مطلق اُن کی نہیں ہے۔ اُن کے ساتھ حسنِ سلوک' خیر کا رویہ' اُن کی خدمت' اُن کا ادب اپنی جگہ پر ہے'

البتہ: ﴿وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ‌ ۚ﴾ ''اور اتباع اُس شخص کے راستے کا کرو جس نے اپنا رُخ میری طرف کرلیا ہو۔'' یہ ہے اصل میں فرق وتفاوت جو ملحوظ رہنا چاہیے' اور یہ توازن مطلوب ہے۔ نہ تو یہ طرزِ عمل کہ والدین کا سرے سے خیال ہی نہ ہو' کوئی پاس لحاظ ہی نہ ہو' اُن کا ادب بھی نہ رہے' اُن کے ساتھ حسنِ سلوک بھی نہ ہو' اُن کی خدمت بھی نہ ہو۔ اور نہ یہ کہ اُن کی پرستش شروع کر دی جائے' یہی دلیل بن جائے کہ ہمارے والدین کا فرمان یہ ہے' ہمارے آباء واَجداد کی رسومات یہ ہیں' ہم ان کو کیسے چھوڑیں! اس کے بین بین ایک روش کی ضرورت ہے جو سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں بیان ہوئی ہے۔

سیاقِ عبارت میں تقویٰ کا مفہوم

زیر مطالعہ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ۝۲۱﴾ ''تاکہ تم بچ سکو!'' اس لفظ (تقویٰ) کے بارے میں ''هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ'' کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔ اس وقت غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں اس کا موزوں ترجمہ کیا ہوگا! عام طور پر مترجمین نے ترجمہ کیا ہے: ''تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔'' لیکن یہ اس مضمون سے مناسبت رکھنے والی بات نہیں ہے کہ بندگی کرو اپنے رب کی تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے' جب کہ یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں۔ انسان بندگی اُسی وقت کرے گا جب اُس کے اندر تقویٰ موجود ہو۔ یہ تو اصل میں وہ روحِ باطنی ہے جو انسان کو بندگی پر آمادہ کرنے والی شے ہے۔ اس ضمن میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۳ بڑی اہم اور جامع ہے:

﴿لَيۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوۡا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحۡسَنُوۡا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝۹۳﴾

''اُن لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کوئی گناہ نہیں ہے اس میں جو وہ (پہلے) کھا پی چکے جب تک وہ تقویٰ کی روش اختیار کیے رکھیں اور ایمان لائیں اور نیک عمل کریں' پھر مزید تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں' پھر اور تقویٰ میں بڑھیں اور درجۂ احسان پر فائز ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ محسنوں سے محبت کرتا ہے۔''

جولوگ ایمان لائے اور عمل صالح کر رہے ہیں وہ پہلے جو کھا پی چکے‘ اس کا اُن پر کوئی الزام نہیں‘ کوئی گناہ نہیں‘ کوئی جواب دہی نہیں۔ یعنی جب تک شراب کی آخری حرمت نہیں آئی تھی‘ اُس سے پہلے جس نے بھی پی ہے اُس کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا‘ جب کہ ان کی روش یہ رہی ہے: ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کہ انہوں نے اللہ کا تقویٰ اختیار کیا‘ ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا﴾ پھر ان کے اندر مزید تقویٰ بڑھ گیا اور اُن کے ایمان میں مزید ترقی ہوئی۔ قلب کے اندرون تک ایمان راسخ ہو گیا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ۔ ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا﴾ پھر ان کے اندر مزید تقویٰ پیدا ہوا اور وہ مقامِ احسان پر فائز ہو گئے۔ ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٣﴾﴾ اور اللہ تعالیٰ محسنین کو پسند کرتا ہے‘ اُن سے محبت کرتا ہے۔

ایک اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیثِ جبریلؑ میں اسی آیت کی وضاحت ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے پہلا سوال کیا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ۔ دوسرا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ۔ تیسرا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ۔ چنانچہ ایمان‘ اسلام اور احسان تین مدارج ہیں اور ان کی طرف لے جانے والی روح تقویٰ ہے۔ انسان کے اندر موجود ایمان کی وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو آخرت کے عذاب سے بچائے‘ اللہ تعالیٰ کی ناراضی سے بچائے۔ اس میں وہ آگے سے آگے بڑھتا چلا جائے گا کہ بقول حالی: ع ”ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!“

قرآن حکیم کے بعض مقامات پر تو یہی ترجمہ موزوں ہے: نماز پڑھو تا کہ تقویٰ پیدا ہو جائے‘ روزہ رکھو تا کہ تقویٰ پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۳ میں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا ترجمہ ”تاکہ تم متقی بن جاؤ“ عقلی اور منطقی اعتبار سے سیاقِ عبارت کے ساتھ پورا ربط رکھتا ہے‘ لیکن آیت زیرِ مطالعہ میں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا ترجمہ اس کے لغوی مفہوم کے اعتبار سے ہوگا: ”تاکہ تم بچ سکو۔“ کس چیز سے بچ سکو؟ اوّل تو یہ کہ عذابِ اُخروی سے بچ سکو۔ پہلے آ چکا ہے: وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ اور وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ اس سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ ہمہ تن‘ ہمہ وجوہ اور ہمہ وقت اللہ کی بندگی

اختیار کرو اور اُس کی محبت سے سرشار ہو کر اُس کے سامنے اپنے آپ کو بچھا دو‘ تاکہ آخرت کے عذاب اور دردناک انجام سے بچ سکو۔

اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس دنیا میں جو فسادِ تمدن ہے‘ افراط و تفریط کے جو دھکے ہیں‘ اگر تم اللہ ربّ العالمین کی بندگی اختیار نہیں کرو گے بلکہ اپنی عقل کی پیروی کرو گے‘ اپنے نفس کی بندگی کرو گے تو پھر لامحالہ تصادم ہوگا‘ مفادات ٹکرائیں گے‘ طبقاتی کشمکش ہوگی۔ حاکم اور محکوم کے درمیان‘ سرمائے اور محنت کے درمیان‘ فرد اور اجتماعیت کے درمیان کھینچ تان اور رسہ کشی ہوگی۔ اِفراط و تفریط کے یہ دھکے نوعِ انسانی کا مقدّر بنے رہیں گے اور تمدنِ انسانی فساد کی آماج گاہ بنا رہے گا۔ لہٰذا اللہ کی بندگی ہی میں خیر کا‘ خیریت کا‘ بھلائی کا‘ امن اور سکون کا پیغام ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا﴾ (الاعراف: ۵۶) ”زمین میں فساد مت مچاؤ اس کی اصلاح کے بعد“‘ وہ اصلاح اسی شکل میں ہوگی کہ سب کے سب ہمہ تن اللہ کی بندگی اختیار کر لیں‘ اُسی کے مطیع و فرماں بردار بن جائیں‘ اُسی کے احکام پر چلیں‘ اُسی کی ہدایت کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا لیں۔

عبادتِ ربّ: دین کی جامع ترین اصطلاح

زیرِ مطالعہ آیت قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ ہے۔ اس لیے کہ دین کے باقی سارے تقاضے درحقیقت اسی کی فروع (corollaries) ہیں۔ میں ”فرائضِ دینی کا جامع تصور“ ایک سہ منزلہ عمارت کے حوالے سے واضح کیا کرتا ہوں۔ اس عمارت کے اوپر کے دونوں حصے درحقیقت اسی ”عبادتِ ربّ“ کا منطقی نتیجہ ہیں۔ جب تم عملاً اللہ کی بندگی اختیار کر رہے ہو تو اپنے وجود سے خود ایک داعی بن گئے ہو‘ اللہ کے دین کا مظہر بن گئے ہو‘ شہادت علی الناس قائم کر رہے ہو۔ دین کی دعوت دینا‘ لوگوں تک اللہ کا دین پہنچانا یہ بھی اللہ کا حکم ہے تو بندگی میں شامل ہے۔ پھر یہ کہ جب اللہ کی بندگی کرنی ہے‘ اُس کا حکم ماننا ہے تو اُس کا سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ اُس کے دین کو قائم کرو: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ﴾ (الشوریٰ: ۱۳)۔ اُس کا حکم ہے کہ اس مقصد کے لیے اپنا تن من دھن لگاؤ۔

اُس کا حکم ہے کہ جان بھی کھپاؤ اور مال بھی خرچ کرو: ((لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا)) (صحیح مسلم:۷۵۶۳) ''تا کہ اللہ کا کلمہ سب سے سربلند ہو جائے۔'' گویا دین کے جتنے بھی عملی تقاضے ہیں وہ سب کے سب اس ''عبادتِ ربّ'' میں آ گئے' جیسے ہم کہتے ہیں ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں''۔ لہٰذا لفظِ ''عبادت'' اتنا جامع اور گہرا (profound) ہے کہ اس کے اندر دین کے سارے عملی تقاضے سمو دیے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت مبارکہ پر توجہ مرکوز کریں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ ''میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔'' اس ایک لفظ کے اندر دین کے سارے عملی تقاضے موجود ہیں۔ دعوتِ قرآنی کی تعبیر کے لیے جامع ترین لفظ یہی ہے: ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾۔ گویا ایک اصطلاح ''عبادتِ ربّ'' کے اندر دین کی دعوت کا خلاصہ اور لُبِ لُباب آ گیا۔ (جاری ہے)

❁❁❁

ایک اہم اطلاع

❁ مکتبہ خدام القرآن لاہور سے کتب اور جرائد کی خریداری کے لیے یا کسی قسم کی شکایت کی صورت میں ان واٹس ایپ نمبرز پر رابطہ کیجیے:

ہفت روزہ ندائے خلافت' ماہنامہ میثاق' سہ ماہی حکمت قرآن : 0341-4941212

کتب : 0301-1115348

❁ ادائیگی کے لیے صرف درج ذیل بینک اکاؤنٹ ہی میں رقم ارسال فرمائیں اور سکرین شاٹ کے ذریعے اس کی اطلاع بھی ضرور کیجیے کہ اسے کس مد میں ارسال کیا گیا ہے:

Dubai Islamic Bank

Account Title : Markazi Anjuman Khuddam Ul Quran (Maktaba)

Branch Code : 010

Branch Name : Peco Road,Lahore

IBAN : PK17DUIB0000000062871003

از: منیجر' مکتبہ خدام القرآن' قرآن اکیڈمی' لاہور

بیسویں صدی کا ایک عظیم داعیٔ قرآن

حافظ طاہر عبداللہ صدیقی' ناصر الدین

خلاصہ

اس تحقیقی مقالے میں پاک و ہند کے عظیم اسلامی سکالر اور مدرس و داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی شخصیت و خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ ایک عظیم مفکر' مصلح (reformer) اور عبقری (intellectual) تھے۔ آپ غیر تقسیم ہندوستان میں پیدا ہوئے اور تحریک پاکستان کے چشم دید گواہ اور سرگرم کارکن رہے۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد اس کی طرف اوّلین ہجرت کرنے والوں میں شامل تھے۔ میڈیکل کی تعلیم کے دوران اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن رہے اور ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے بعد مولانا مودودیؒ کی قائم کردہ جماعت اسلامی پاکستان میں شامل ہوئے۔ بعد میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحبؒ فکری لحاظ سے علامہ اقبال' ڈاکٹر رفیع الدین' سید ابوالاعلیٰ مودودی' حمید الدین فراہی' امین احسن اصلاحی' شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ موصوف کے فکر و منہج پر ان حضرات کا بڑا اثر رہا۔

دینی خدمات کے لیے ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے تین ادارے قائم کیے: (۱) مرکزی انجمن خُدام القرآن لاہور (۲) تنظیم اسلامی (۳) تحریک خلافت پاکستان۔ یہ ادارے اپنے مقاصد اور عزائم کو سامنے رکھتے ہوئے ملک میں بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ برسرِکار ہیں۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے تحریر اور تقریر کی سطح پر بہت کام کیا ہے۔ ایک عظیم موادِ تحقیق و جستجو اور راہنمائی کے لیے دستیاب ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی اپنی تصانیف ایک صد کے قریب ہیں۔ علاوہ ازیں' ان کے جاری کردہ تین جرائد بھی ہیں: (۱) ماہ نامہ ''میثاق'' (۲) سہ ماہی ''حکمتِ قرآن'' (۳) ہفت روزہ ''ندائے خلافت''۔ مزید یہ کہ ڈاکٹر صاحبؒ کے آڈیو/ویڈیو

خطاباتِ بزبانِ اردو اور انگریزی کا ایک عظیم خزانہ موجود ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی انہی خدمات کو دیکھتے ہوئے علمی اختلافات سے قطع نظر موصوف کو بلاشبہ بیسویں صدی عیسوی کے تحریر وتقریر بالخصوص درسِ قرآن کے میدان کا ''مجدد'' کہا جاسکتا ہے۔

تعارف

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے آباء واجداد کا تعلق یوپی کے ضلع مظفر نگر سے تھا اور وہ وہیں آباد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے آپ کے دادا کو انگریز سرکار کی طرف سے عتاب کا اندیشہ تھا' لہٰذا وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے مشرقی پنجاب آ گئے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی ولادت ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو مشرقی پنجاب کے ایک قصبہ حصار میں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحبؒ بچپن ہی سے انتہائی حساس مزاج کے حامل تھے اور اللہ نے انہیں کم عمری میں ہی شعور کی دولت عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں جب اُنہیں علامہ اقبال کے وصال کی خبر ملی تو اُنہوں نے اسے ایک ذاتی صدمے اور قومی نقصان کے طور پر محسوس کیا جبکہ ان کی عمر صرف چھ برس تھی۔ علامہ اقبال سے دلی لگاؤ کا عالم یہ تھا کہ محض ۱۰ برس کی عمر میں اُن کی اردو شاعری کے پہلے مجموعہ ''بانگِ درا'' کا مطالعہ مکمل کر لیا۔ علامہ اقبال کے اُن اشعار نے آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا جن میں اُمت کے پھر سے عروج کے لیے امید افزا پیغام ہے۔ مثلاً: ؎

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
سبق پھر پڑھ صداقت کا' عدالت کا' شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

البتہ ''جوابِ شکوہ'' کے ایک شعر نے ڈاکٹر صاحبؒ کو ہلا کر رکھ دیا: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

اس شعر سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہوگئی کہ اُمت کے زوال کا اصل سبب قرآن حکیم سے

دوری ہے۔ یوں گویا اوائل عمر ہی سے خدمتِ قرآن کا جذبہ آپ کی سوچ میں سرایت کر گیا۔ اس کے بعد اسلام کو پھر سے غالب کرنے کا ولولہ بڑی شدت سے موجزن ہو گیا جب ۱۳ برس کی عمر میں حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام'' پڑھا' جس کا عنوان یہ شعر ہے: ؎

کیا فردوسیٔ مرحوم نے ایران کو زندہ
خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ!

خدمات

ڈاکٹر اسرار احمد ﷫ کی دینی خدمات کے کئی پہلو ہیں' ان کے فکر کی بے شمار جہات ہیں جو وقت کے ساتھ کھلتی چلی جائیں گی۔ ان کی فکری تشکیل میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تصوراتِ دین نے اگرچہ بنیادی کردار ادا کیا لیکن خود ڈاکٹر صاحبؒ نے یقینی طور پر اس فکر کے بہت سے خلا پُر کیے اور بہت سے نئے گوشے آشکار کیے۔ ان کی تمام جِدّوجُہد' حرکت وعمل اور تنظیم وتحریک کا محور قرآن مجید اور سُنّتِ رسول ﷺ ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تفہیم کے لیے ان کی زبان کی گرہیں کھول دی تھیں' گویا قرآن کو ان کی زبان پر آسان کر دیا تھا۔ ان کے دروسِ قرآن کا غلغلہ نصف صدی سے زائد عرصے تک پوری دنیا میں برپا رہا۔ قرآن حکیم کے بیان میں بلاشبہ ان کا کوئی ثانی اور مدِّمقابل نہ تھا۔ ان کے فکر کا منبع وماخذ کُلّی طور پر قرآن مجید تھا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے فکر کا ایک مستقل نظریہ یہ تھا کہ کوئی بھی اسلامی تحریک اُس وقت تک کسی قسم کی اجتماعی اور مؤثر تبدیلی نہیں لاسکتی جب تک اس کے ارکان ''ایمانِ حقیقی'' کی نعمت سے سرفراز نہ ہوں' اپنی انفرادی زندگی میں اسلام کے احکام پر مکمل طور پر عمل پیرا نہ ہوں اور اپنی معاشرت ومعیشت کو اسلامی خطوط پر ڈھال نہ چکے ہوں۔ اس نظریے کا اگلا جزو یہ ہے کہ ''ایمانِ حقیقی'' کے حصول کے ذرائع تو بہت ہیں' یہ نعمت عمل صالح سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے اور صالحین کی صحبت سے بھی' لیکن اس کا مؤثر ترین ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ یہ ''صالحین'' بھی قرآن حکیم ہی پیدا کرے گا۔ لہٰذا قرآن کی طرف حقیقی رجوع کے بغیر صالحین کی ایسی جماعت پیدا نہیں ہوسکتی جو اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ ثابت ہو۔

ڈاکٹر صاحبؒ کو اس بات کا بھی شعوری ادراک تھا کہ اُمتِ مُسلمہ کے زوال کی اصل وجہ قرآن حکیم سے دُوری ہے۔ جب اُمت نے قرآن کے پیغام کو فراموش کر دیا تو وہ فقہی' مسلکی

اور فروعی مسائل میں اُلجھ کر رہ گئی۔ یوں اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ قرآن سے اُمّت کا تعلق محض اسے پڑھنے‘ حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب تک محدود ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحبؒ نے عظمتِ قرآن کو اُجاگر کیا اور اس بات کو باور کرایا کہ قرآن مجید کی صورت میں اُمّتِ مُسلمہ کے پاس ایک عظیم نعمت موجود ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کا زندۂ جاوید معجزہ ہے۔ پھر انہوں نے تفصیل سے ’’مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق‘‘ کے عنوان سے تقریر کی‘ جو بعد میں باقاعدہ کتابی شکل میں وسیع پیمانے پر شائع کی گئی۔ اس اشاعتِ عام کا مقصد اُمّت کو قرآن حکیم کے ہر پہلو کی طرف راغب کرنا تھا تاکہ وہ کلامِ الٰہی کی تلاوت کے ساتھ اس کو سمجھنے کی طرف بھی متوجہ ہو۔ یہ بلاشبہ ایک لاجواب تحریر ہے۔ اس کتابچے کے مختلف زبانوں میں تراجم بھی ہوئے۔ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن کی طرف راغب کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحبؒ نے حضور ﷺ کے اس قولِ مبارک کو عام کیا کہ ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ)) (صحیح البخاری) ’’تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جو خود قرآن کا علم حاصل کریں اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیں۔‘‘

ڈاکٹر صاحبؒ نے چودھویں صدی ہجری کے عظیم مجدّد اور مجاہد شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے درج ذیل قول سے تقویت حاصل کی اور اسے بہت عام کیا۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:

’’میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں‘ تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا‘ دوسرا آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کردوں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے‘ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی عام کیے جائیں‘ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے‘ اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔‘‘

ڈاکٹر صاحبؒ کو اس تشخیص پر کامل یقین تھا‘ لہٰذا انہوں نے اپنی زندگی قرآن کریم کی نشرو اشاعت کے مبارک کام میں کھپا دی۔ ان کی اس تشخیص کو مزید تقویت بیسوی صدی عیسوی کے عظیم فلسفی علامہ اقبالؒ کے افکار سے حاصل ہوئی۔ وہ زمانۂ طالب علمی ہی سے علامہ اقبالؒ کے فکر

سے متاثر تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ علامہ اقبالؒ کے افکار آپ پر آشکارا ہوتے گئے۔ ان کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

’’چنانچہ ان کے اشعار تو ایمان و یقین کے کیف و سرور‘ محبتِ الٰہی اور عشقِ رسول ﷺ کے سوز و گداز اور جذبۂ جوشِ ملی سے مملو ہیں ہی‘ ان کے خطبات بھی درحقیقت وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر مطالعۂ قرآن حکیم ہی کی ایک کوشش کا مظہر ہیں جس کے ذریعے علامہ مرحوم نے جدید ریاضیات و طبیعیات اور فلسفہ و نفسیات کا رشتہ قرآن حکیم کی اساسی تعلیمات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر دورِ حاضر میں دین و مذہب کی گاڑی کا آگے چلنا محالِ مطلق ہے۔‘‘

علامہ اقبالؒ کے اشعار کے ذریعے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو وہ یہ پیغام بھی دینا چاہتے تھے کہ قرآن کی قوتِ تسخیر اس قدر شدید ہے کہ مغرب و مشرق کے فلسفوں کا ماہر بھی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ یہ فقط مذہبی ذہن کے لوگوں ہی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ علامہ اقبال جیسا مغربی دنیا کے علوم سے فیض یاب ہونے والا فلسفی بھی قرآن کی عظمت کا قائل ہے۔ وہ علامہ اقبال کو بہت بڑا ترجمان القرآن سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں:

’’واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور سب سے بڑا داعی الی القرآن علامہ اقبال ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی عظمت کا جس گیرائی اور گہرائی کے ساتھ احساس علامہ اقبال کو ہوا‘ میری معلومات کی حد تک اس درجے عظمت کا انکشاف کسی اور انسان پر نہیں ہوا۔ جب وہ قرآن مجید کی عظمت بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کی دید اور ان کا تجربہ ہے۔‘‘

انجمن خدّام القرآن کا قیام

ڈاکٹر صاحبؒ کی قرآنی خدمات کے ضمن میں اولیت تو ان کے دروسِ قرآن کو حاصل ہے۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں ان کے دروسِ قرآن کا چرچا تھا۔ ان کے ذریعے انہوں نے لاکھوں انسانوں کو متاثر کیا اور ان کی زندگی میں انقلاب برپا ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد جب وہ ساہیوال میں سکونت پذیر ہوئے تو وہاں اور گردونواح میں حلقہ ہائے دروسِ قرآن قائم کیے۔ یہ دروس انتہائی مقبول ہوئے۔ جب ۱۹۵۸ء میں کراچی تشریف لائے تو یہاں بھی آپ کے دروسِ قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۶۵ء میں لاہور میں مستقلاً رہائش پذیر

ہوئے تو دروسِ قرآنی کے حلقے وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے۔ خود لکھتے ہیں:

''۱۹۶۵ء ہی کے وسط میں راقم الحروف غلبہ و اقامتِ دین کی جدّ و جُہد کے پختہ ارادے اور تعلّم و تعلیم قرآن کی منظم منصوبہ بندی کے عزمِ مصمّم کے ساتھ دوبارہ واردِ لاہور ہوا۔ چنانچہ وہ دن اور آج کا دن' یہی دو کام میری زندگی کا مرکز و محور رہے ہیں اور ان پچیس سالوں کے دوران الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ میرے اوقات اور میری صلاحیتوں اور میری توانائیوں کا اکثر و بیشتر حصہ اصلاً غلبہ و اقامتِ دین کی جدّو جُہد اور عملاً تعلّم و تعلیم قرآن کی مساعی میں صرف ہوا ہے۔''

ڈاکٹر صاحبؒ کی مندرجہ بالا تحریر ۱۹۹۰ء کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی حیاتِ دُنیوی کا آخری لمحہ بھی اسی کام میں صرف کیا ہے۔

لاہور میں مسجد خضراء اور مسجد شہداء کے ہفتہ وار دروسِ قرآن کو بہت شہرت ملی۔ جو لوگ ان دروسِ قرآن میں شریک رہے ہیں وہ ان روح پرور مناظر کے چشم دید گواہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے دروسِ قرآن کا یہ سلسلہ لاہور اور اس کے مضافات ہی تک محدود نہ رہا بلکہ دوسرے بڑے شہروں میں بھی ماہانہ دروسِ قرآن کی محافل منعقد ہونے لگیں۔ چنانچہ کراچی میں تاج محل ہوٹل کی ''شامِ الہدیٰ'' اور اسلام آباد کے کمیونٹی سینٹر' آب پارہ کے ماہانہ درسِ قرآن سے ہزاروں تشنگانِ علم سیراب ہوئے۔ ان سطور کا ایک راقم بھی ۱۹۸۴ء/ ۱۹۸۵ء میں تاج محل ہوٹل کے ماہانہ درسِ قرآنی ہی سے ڈاکٹر صاحبؒ کے فکر اور شخصیت سے متعارف ہوا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے ان دروسِ قرآنی کے سامعین کی بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اہل ثروت طبقے پر مشتمل ہوتی تھی' کیونکہ ان کا معیار انتہائی اعلیٰ علمی سطح کا ہوتا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

''میرے مخاطبین یہی لوگ ہیں' اگر سوسائٹی کا یہ طبقہ تبدیل ہو جائے تو یہ تبدیلی خود بخود نچلی سطح تک پہنچے گی' کیونکہ یہی لوگ معاشرے کا رجحان بنانے اور بگاڑنے والے ہوتے ہیں اور عام لوگ انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔''

۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کے قیام کے ساتھ ہی محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے دستورِ انجمن میں اپنا یہ عزم ظاہر فرما دیا تھا کہ وہ انجمن کے قیام ہی کو اپنی منزل نہیں سمجھتے بلکہ ان کے پیش نظر اصل کام ایک ایسا تحریکی قافلہ تشکیل دینا ہے جو غلبہ و اقامتِ دین کی جدّ و جُہد کے لیے اپنا تن من دھن نچھاور کر سکے۔ ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۴ء حلقہ ہائے دروسِ قرآن کے ذریعے

شہر لاہور میں قرآن کے انقلابی پیغام کو پہنچانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پڑھے لکھے طبقات پر مشتمل ایک حلقۂ احباب وجود میں آ گیا' جو اپنی تمام دینی ذمہ داریوں بالخصوص اقامتِ دین کی جدّ و جُہد کے لیے قلباً اور ذہناً آمادہ ہو چکے تھے۔ ۱۹۷۴ء کی قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر ڈاکٹر صاحبؒ نے اعلان کر دیا کہ وہ مذکورہ بالا مقصد کی خاطر ایک اجتماعیت تشکیل دینے کا پختہ ارادہ رکھتے ہیں۔

تنظیم اسلامی کا قیام

ڈاکٹر صاحبؒ نے ۱۹۷۵ء میں دین اسلام کے غلبے اور اقامتِ دین کی جدّ و جُہد کے لیے اپنے حسبِ عزم ''تنظیم اسلامی'' قائم کی لیکن ابتدا میں اس جماعت کی امارت کی ذمہ داری قبول نہیں کی بلکہ کنوینر کے طور پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اُن بزرگ حضرات کے لیے جو ۱۹۶۷ء میں تنظیم اسلامی کے قیام پر متفق ہوئے تھے' اس نئی اجتماعیت کے دروازے کھلے رکھے جائیں' اور انہی میں سے کوئی بزرگ اِس جماعت کی امارت کا منصب سنبھالیں۔ ڈھائی سال کے انتظار کے باوجود کوئی بزرگ اِس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ بالآخر اگست ۱۹۷۷ء میں تنظیم اسلامی کے تیسرے سالانہ اجتماع کے موقع پر ڈاکٹر صاحبؒ نے تنظیم اسلامی کی امارت کی ذمہ داری قبول کی۔ اس موقع پر یہ طے کیا گیا کہ اس جماعت کی اساس قرآن و سنّت اور سلف صالحین کے آثار سے ماخوذ بیعت سمع و طاعت کے اصول پر ہوگی۔

اَسفار

ڈاکٹر صاحبؒ کا فکرِ قرآنی جغرافیائی حدود سے نکل کر دوسرے ممالک تک پہنچ گیا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۷۹ء میں امریکہ کا پہلا دعوتی و تبلیغی دورہ کیا' جو بعد میں مختصر وقفوں کے ساتھ مسلسل جاری رہا۔ امریکہ کی سرزمین آپ کی دعوتِ قرآنی کے لیے انتہائی سازگار ثابت ہوئی۔ ۱۹۸۴ء میں مکہ مسجد' حیدر آباد دکن (بھارت) میں مسلسل تین دن ہزاروں خواتین و حضرات نے آپ کے کئی کئی گھنٹوں پر محیط دروسِ قرآن سنے۔ ۱۹۸۵ء میں ابوظبی کا دورہ کیا اور مختلف موضوعات پر بھرپور دروسِ قرآن دیے' جن کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی موجود ہے۔ یہاں ڈاکٹر صاحبؒ کے صرف ابتدائی بیرونی اسفار کا ذکر کیا گیا ہے' اگر اس داستان کو مرتب کیا جائے تو علیحدہ سے ایک کتاب اس کی متقاضی ہوگی۔

پاکستانی میڈیا

ڈاکٹر صاحبؒ کے قرآنی فکر کو اُس وقت ایک نئی جہت ملی جب پاکستان ٹیلی ویژن نے ان کے لیے اپنے دروازے کھول دیے۔ ان دروس نے آپ کے فکر اور شخصیت دونوں کو خوب متعارف کرایا۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر ''بیان القرآن'' کے عنوان سے ایک پروگرام شروع ہوا' جو چار سال تک مسلسل چلتا رہا۔ اس کے علاوہ تین سال تک ہر رمضان المبارک میں پی ٹی وی پر آپ کے پروگرام ''الکتاب''، ''الٓمّٓ'' اور ''حکمت و ہدایت'' جاری رہے۔ ربیع الاوّل میں فلسفہ رسالت کے بارے میں آپ کا پروگرام ''رسولِ کامل ﷺ'' بھی پی ٹی وی پر ٹیلی کاسٹ ہوا۔ اس پروگرام کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی موجود ہے۔

پی ٹی وی کے جس پروگرام نے ڈاکٹر صاحبؒ کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا وہ درسِ قرآن کا ہفتہ وار پروگرام ''الہدیٰ'' ہے' جو پندرہ ماہ تک جاری رہا۔ پھر اس پروگرام کو مخالفین کے اعتراضات کی وجہ سے صاحبانِ اقتدار نے بند کرا دیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن نے تو اپنے دروازے ڈاکٹر صاحبؒ پر بند کر دیے لیکن قرآنی فکر کے افشا کے لیے اللہ تعالیٰ نئے نئے راستے کھولتا رہا۔ جب الیکٹرانک میڈیا آزاد ہوا اور پرائیویٹ سیکٹر میں نئے چینلز کھلنے لگے تو ڈاکٹر صاحبؒ کے دروسِ قرآنی کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ چنانچہ ترجمہ و تفسیرِ قرآن کا پروگرام ''بیان القرآن'' Qtv سمیت مختلف چینلز پر لاکھوں انسانوں کے قلوب و اذہان کو مسخر کرنے کا ذریعہ بنا۔ البتہ ڈاکٹر صاحبؒ کے زوردار قرآنی فکر نے پھر کچھ لوگوں کو پریشان کر دیا۔ ان شر پسند عناصر نے اپنی مسلکی تنگ نظری کے باعث اس فکر انگیز پروگرام کو بند کرا دیا' لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک اور راستہ نکال دیا۔ چنانچہ محترم ڈاکٹر عبدالکریم ذاکر نائیک حفظہ اللہ کے Peace TV کے ذریعے آج بھی لاکھوں لوگ نورِ قرآنی سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

دورۂ ترجمۂ قرآن مجید

ڈاکٹر صاحبؒ کی خدماتِ قرآنی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کو حاصل ہے۔ اس طرح کے طویل دورانیے کے پروگرام کی کوئی دوسری مثال ڈاکٹر صاحبؒ سے پہلے نہیں ملتی۔ اس کا آغاز ۱۴۰۴ھ (۱۹۸۴ء) کے رمضان المبارک میں مسجد جامع القرآن' قرآن اکیڈمی' لاہور سے ہوا۔ صلوٰۃ التراویح کی ہر چار رکعات میں قرآن

مجید کے جتنے حصے کی تلاوت کی جاتی' پہلے اس کا ایک رواں ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کر دی جاتی۔ پھر قاری جب قرآن کی تلاوت شروع کرتا تو سامعین پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔

یہ روح پرور پروگرام رات دو ڈھائی بجے تک جاری رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پروگرام کو اس قدر پذیرائی بخشی کہ ہر رمضان المبارک میں مسجد جامع القرآن میں ایک عجیب ایمان پرور منظر دیکھنے کو ملتا۔ مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی' جن کا انہماک بھی دیدنی ہوتا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملک بھر میں دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام شروع ہو گئے' جو آج تک جاری ہیں۔ بلا مبالغہ' ملک بھر میں سینکڑوں مقامات پر ڈاکٹر صاحبؒ کے تلامذہ بنفسِ نفیس دورۂ ترجمۂ قرآن کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ ان سطور کا ایک راقم بھی انہی میں سے ہے۔ فللہ الحمد!

بیان القرآن (ترجمہ و مختصر تفسیر)

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن کو قرآن اکیڈمی لاہور کے شعبہ مطبوعات نے تسوید و تبییض' ترتیب و تدوین اور تحقیق و تدقیق کے مراحل سے گزار کر کتابی صورت میں شائع کیا ہے' جسے دعوت رجوع الی القرآن کے ایک انتہائی اہم سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا پہلا حصہ ڈاکٹر صاحب کی حیاتِ مستعار ہی میں (۲۰۰۸ء میں) شائع ہو گیا تھا اور اس کی غیر معمولی مقبولیت اور پذیرائی نے انہیں اس کے بقیہ کام کے بارے میں ایک خوش گوار اضطراب سے دوچار کر دیا تھا۔ ۲۰۱۰ء میں اس کا دوسرا حصہ اشاعت کے لیے تیار تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو مالکِ حقیقی کی جانب سے بلاوا آ گیا۔ بہرحال ''بیان القرآن'' کا سال بہ سال ایک حصہ منصۂ شہود پر آتا رہا' تا آنکہ جون ۲۰۱۵ء کے آغاز میں یہ کٹھن کام سات حصوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ۲۰۲۱ء میں ''بیان القرآن'' کو ایک نئی ترتیب و تقسیم کے ساتھ تقریباً برابر ضخامت کی چار جلدوں میں ''طبع جدید'' کے طور پر پیش کیا گیا' جو متعدد ظاہری و باطنی خوبیوں کا حامل ہے۔ فروری ۲۰۲۵ء میں ''بیان القرآن'' ہی کے ترجمہ اور منتخب حواشی کے ساتھ ''مختصر بیان القرآن'' نذرِ قارئین کیا گیا۔ حواشی کے انتخاب میں ڈاکٹر صاحبؒ کے قرآنی فکر کو مقدم رکھا گیا ہے۔ (اضافہ از مدیر ''میثاق'')

مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

دروسِ قرآن کے ضمن میں ''مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

اس کی بنیاد تو سورۃ العصر ہے‘ پھر اس کے پانچ حصے ہیں‘ جو سورۃ العصر کے مضامین ہی کو کھولتے ہیں۔ اس میں تصورِ دین کو واضح کرنے کے ساتھ ایک مؤمن کے دینی فرائض کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اس منتخب نصاب کو ڈاکٹر صاحبؒ نے مختلف مواقع پر بیان کیا ہے۔ بعض دروس مختصر جبکہ بعض بہت مفصل اور علمی سطح کے ہیں۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحبؒ نے ’’منتخب نصاب (حصہ دوم)‘‘ بھی مرتب فرمایا۔ یہ بھی بہت اہم ہے۔ اس حصہ میں قرآن حکیم کی روشنی میں ایک اسلامی تحریک کے رفقاء کے باہمی تعلقات‘ امیر و مامور کا باہمی تعلق‘ تحریکی کام کے تقاضے اور اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سے علمی مباحث شامل ہیں‘ جن کی مدد سے حضورﷺ کی برپا کردہ اسلامی تحریک کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

قرآن کانفرنسز

ڈاکٹر صاحبؒ کی قرآنی خدمات میں ’’قرآن کانفرنسوں‘‘ کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ان کو بہت شہرت ملی۔ قرآن حکیم کے علوم و معارف کو عام کرنے میں ان کانفرنسوں نے اہم کردار ادا کیا‘ جن میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء اور اہلِ فکر و دانش کو مدعو کیا جاتا۔ ہر کانفرنس کا ایک خاص موضوع ہوتا‘ جس پر علماء کرام مقالے پڑھتے اور تقاریر کرتے۔ پاکستان کے علاوہ بھارت سے جید علماء‘ جیسے مولانا اخلاق حسین قاسمی‘ مولانا سعید احمد اکبر آبادی‘ مولانا عبدالکریم پاریکھ اور مولانا وحید الدین خان وغیرہم (رحمہم اللہ) کو بھی مدعو کیا گیا۔ بعد میں ان کی جگہ ’’محاضراتِ قرآنی‘‘ کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحبؒ وضاحت کرتے ہیں:

> ’’مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام اسی بنیاد پر عمل میں آیا تھا‘ چنانچہ اس کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۷۳ء سے مسلسل سات سال تک قرآن کانفرنسوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا۔ لاہور اور کراچی میں بفضلہٖ تعالیٰ ہم نے سات نہایت عالی شان سالانہ قرآن کانفرنسیں منعقد کیں۔ اس کے بعد بعض اسباب سے ہم نے عنوان بدلا‘ جن میں سب سے بڑا سبب جس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے لیے باعثِ مسرت اور بارگاہ ربّ العزت میں ہماری ان حقیر کوششوں کے مقبول ہونے کا کسی درجہ میں سہی ایک

> مظہر بھی ہے‘ یہ تھا کہ ’’قرآن کانفرنس‘‘ کا لفظ اتنا مقبول‘ اتنا معروف اور اتنا مشہور ہوا کہ جابجا دوسرے اداروں کی طرف سے نہ صرف متعدد قرآن کانفرنسیں‘ جنہیں بجا طور پر قرآن کانفرنسیں قرار دیا جا سکتا ہے‘ منعقد ہوئیں‘ بلکہ بات یہاں تک جا پہنچی کہ اگر کسی تجوید کے مدرسے کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کا انعقاد ہوا تو اس کا عنوان بھی ’’قرآن کانفرنس‘‘ قرار دیا جانے لگا‘ تو ہم نے پھر اس کو چھوڑ کر ’’محاضراتِ قرآنی‘‘ کی اصطلاح سے ان مجالس کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا۔‘‘

محاضراتِ قرآنی

ان کا آغاز ۱۹۸۹ء سے ہوا۔ یہ محاضرات کراچی میں بھی منعقد ہوئے اور لاہور میں بھی۔ چنانچہ ایک موضوع کا انتخاب کیا جاتا‘ اس پر ڈاکٹر صاحبؒ متعدد قرآنی لیکچر دیتے۔ ہر لیکچر کے بعد اہلِ فکر و دانش کا ایک پینل اس علمی موضوع سے متعلق سوالات کرتا‘ ڈاکٹر صاحبؒ ان کی وضاحت کرتے۔ یہ پینل مختلف مکاتبِ فکر کے جید علماء‘ جدید فکر کے حامل اہلِ فکر‘ وکلاء اور صحافیوں پر مشتمل ہوتا۔ ۱۹۸۹ء میں منعقد ہونے والے محاضراتِ قرآنی کا موضوع ’’اسلام کا نظامِ حیات‘‘ تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اسلام کا روحانی و اخلاقی نظام‘ اسلام کا معاشرتی نظام‘ اسلام کا سیاسی نظام اور اسلام کا معاشی نظام پر اڑھائی اڑھائی گھنٹے خطاب فرمائے‘ جن کے بعد تیکھے اور چبھتے ہوئے سوالات کے جواب دیے۔ ۱۹۹۱ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے محاضراتِ قرآنی کا موضوع ’’حقیقتِ ایمان‘‘ تھا۔ اس موضوع کو پانچ ذیلی موضوعات میں تقسیم کیا گیا۔ یہ محاضراتِ قرآنی اب کتابی شکل میں موجود ہیں۔

تحریکِ خلافت پاکستان

۱۹۹۱ء میں ’’تحریکِ خلافت پاکستان‘‘ کا آغاز کرنے کے بعد محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے پورے پاکستان کا مفصل دورہ کیا‘ جس کے دوران تمام بڑے شہروں میں عوامی جلسوں سے خطاب فرمایا۔ بعد ازاں کراچی‘ لاہور‘ راولپنڈی‘ پشاور‘ کوئٹہ اور ملتان میں ہالز اور آڈیٹوریمز کے پُرسکون ماحول میں ’’خطباتِ خلافت‘‘ کی صورت میں خالص علمی اور عقلی استدلال کے ساتھ نظامِ خلافت سے متعلق ان جملہ مسائل و مشکلات کا حل پیش کیا جو بالعموم نہ صرف مخالفین بلکہ موافقین کے ذہن میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ پانچ خطبات اب ’’خلافت کی حقیقت اور

عصرِ حاضر میں اس کا نظام'' کے عنوان سے کتابی شکل میں دستیاب ہیں۔ مذکورہ بالا محاضرات اعلیٰ علمی سطح کے حامل ہیں۔ ان کے ذریعے اہلِ علم و دانش تک قرآن حکیم کی دعوت کو پہنچایا گیا۔

رفقاء کار

ڈاکٹر صاحبؒ اس اعتبار سے انتہائی خوش قسمت انسان تھے کہ انہیں ایسے رفقاء کار میسر آئے جو آپ کے کام کو جدید انداز میں محفوظ کرتے رہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحبؒ کے دروسِ قرآنی آڈیو/ویڈیو کیسٹس' سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز میں محفوظ ہیں۔ دعوتِ قرآنی کی نشر واشاعت میں ان کیسٹس اور سی ڈیز نے انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی مدد سے لاکھوں انسان نورِ قرآنی سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ اگرچہ اب ہمارے درمیان میں موجود نہیں' لیکن جدید سائنس کا یہ کرشمہ ہے کہ ان کی آڈیو/ویڈیو اور سی ڈیز سے ہم ایسے مستفید ہو سکتے ہیں جیسے کہ وہ ہمارے سامنے درس دے رہے ہوں!

تحریک رجوع الی القرآن

ڈاکٹر صاحبؒ کو اس بات کا کامل ادراک تھا کہ ''رجوع الی القرآن'' کی اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے ٹھوس بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے' چنانچہ انہوں نے اس کام کو ادارہ جاتی شکل میں منظم کرنے کا خواب دیکھا۔ ان کے بہت سے خواب ان کی زندگی میں شرمندۂ تعبیر ہوئے جبکہ کچھ کام وہ ادھورے چھوڑ گئے جو ان کے فکری وارثوں کے کرنے کے ہیں۔

سب سے پہلے انہوں نے اپنے قیام ساہیوال کے دوران ایک ''قرآنی دار المقامہ'' قائم کیا' جہاں کالج میں زیر تعلیم طلبہ کو رہائش فراہم کر کے' انہیں عربی زبان اور قرآن حکیم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ نوجوانوں کو قرآن حکیم کی طرف لانے کی یہ اولین کوشش تھی۔

۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے ایک اشاعتی ادارہ ''دار الاشاعت الاسلامیہ'' قائم کیا' جس کا مقصد قرآنی مطبوعات کی اشاعت تھا۔ یہ ادارہ ڈاکٹر صاحبؒ نے اُس رقم سے قائم کیا جو انہیں اپنے بھائیوں سے کاروباری علیحدگی کے باعث حاصل ہوئی۔ اس ادارے نے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تصانیف اور ان کی معرکۃ الآراء تفسیر ''تدبر قرآن'' کی ابتدائی جلدیں شائع کیں۔ ماہنامہ ''میثاق'' جو پہلے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی زیر ادارت نکلتا تھا اور کچھ عرصہ سے بند تھا' وہ بھی دوبارہ شائع کرنا شروع کیا۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے ۱۹۷۲ء میں ''مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور'' قائم کی۔ اس کے قیام کے مقاصد میں علومِ قرآنی کی اشاعت اور مختلف تعلیمی اداروں کے قیام کے لیے وسائل مہیا کرنا تھا۔ انہوں نے ۱۹۶۷ء میں ایک قرآن اکیڈمی کا خواب دیکھا تھا۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

''.........ایک قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے' جو ایک طرف علومِ قرآنی کی عمومی نشر واشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم جدیدہ سے بھی بہرہ وَر ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔ علوم قرآنی کی عمومی نشر واشاعت کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کی توجہات قرآن حکیم کی طرف مرکوز ہوں گی' ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہوگا' دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہوگی اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہوگا۔ نتیجتاً بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں گے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے اچھی بھلی تعداد ایسے نوجوانوں کی نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی کو اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر واشاعت کے لیے وقف کر دیں۔ ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہوگا اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے' یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں سبقاً سبقاً قرآن پڑھایا جائے اور ساتھ ہی حدیث نبویﷺ' فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جائے۔''

ڈاکٹر صاحبؒ نے قرآن اکیڈمی کا خواب کیوں دیکھا؟ اس کی وضاحت بھی انہوں نے کر دی۔ انہیں اس بات کا بھی ادراک تھا کہ دینی مدارس میں قرآن کی طرف رجوع بہت کم ہے۔ پھر اس بات کی نہ کوئی ترغیب ہے' نہ اہتمام کہ عوام الناس تک قرآنی علوم پہنچائے جائیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''یہ عرض کرنا غالباً خارج از محل شمار نہیں ہوگا کہ خود علماء کے حلقوں میں تاحال قرآن حکیم پر توجہ اس درجہ مرکوز نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ راقم الحروف نے ایک بار مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ سے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر تو ہمارے یہاں ضخیم تصانیف موجود ہیں لیکن اصولِ تفسیر پر کل دو مختصر رسالے ملتے

ہیں: ایک امام ابن تیمیہؒ کا اور دوسرا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا؟ اس کا جواب تو مولانا نے قدرے توقف سے یہ دیا کہ اصل میں اصولِ فقہ کی کتابوں میں اصولِ تفسیر بھی زیرِ بحث آ جاتے ہیں لہٰذا علیحدہ تصانیف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جب میں نے یہ دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ کے دار العلوم میں تخصص فی الحدیث کا شعبہ بھی ہے اور تخصص فی الفقہ کا بھی، لیکن تخصص فی التفسیر کا شعبہ موجود نہیں، تو اس پر مولانا نے پوری فراخ دلی کے ساتھ تسلیم فرمایا کہ یہ ہماری کوتاہی ہے۔‘‘

قرآن اکیڈمی کا قیام

چنانچہ انہوں نے ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی قائم کی تاکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان قرآن حکیم پر غور و فکر، بحث و تحقیق اور نشر و اشاعت کا بیڑا اٹھائیں اور یہ ان کی زندگی کا مقصد ٹھہرے۔ قرآن اکیڈمی کے قیام کے ساتھ ہی ایسے نوجوانوں کی تیاری کا کام شروع کر دیا گیا۔ ابتداءً جب دو سالہ دینی کورسز کا اجراء ہوا تو نوجوانوں کو راغب کرنے کے لیے باقاعدہ وظائف بھی دیے جاتے، مفت رہائش اور خوراک کا اہتمام بھی کیا جاتا۔ الحمدللہ، نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اس کام کے لیے تیار ہوگئی۔ بعد ازاں ایک سالہ ’’رجوع الی القرآن کورس‘‘ متعارف کرایا گیا جو اب تک باقاعدگی سے جاری ہے۔ اس میں خواتین بھی شریک ہوتی ہیں۔ چنانچہ حلقۂ خواتین میں قرآنی فکر پہنچانے کے لیے اچھی خاصی تعداد خواتین مدرسین کی بھی تیار ہو چکی ہے جن میں حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کی صاحبزادیاں بھی شامل ہیں۔

پہلی قرآن اکیڈمی لاہور میں قائم ہوئی۔ الحمدللہ اب تمام بڑے شہروں کراچی، فیصل آباد، ملتان اور جھنگ میں قرآن اکیڈمیز معرض وجود میں آ چکی ہیں۔ لہٰذا تمام جگہوں پر اس نوعیت کے کورسز کا اجراء کیا جاتا ہے۔ طویل کورسز کے ساتھ مختصر دورانیے کے عربی زبان کی تفہیم کے کورسز بھی تمام جگہوں پر جاری رہتے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن اکیڈمی کراچی اور جھنگ بہت وقیع اور عمدہ کام کر رہی ہیں۔

قرآن کالج کا قیام

قرآن اکیڈمیز کے علاوہ ۱۹۸۹ء میں قرآن کالج کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اس کا مقصد بھی عصری علوم کے ساتھ دینی علوم خصوصاً قرآن حکیم کی تفہیم کا اہتمام کرنا ہے۔ اب قرآن کالج کو ’’کلیۃ القرآن‘‘ میں بدل کر ایک جدید اسلامی مدرسے کی شکل دی گئی ہے جہاں درسِ نظامی کے

ساتھ عصری علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ قرآن کالج، یعنی کلیۃ القرآن کے ساتھ ایک شاندار قرآن آڈیٹوریم بھی قائم ہے جہاں ڈاکٹر صاحبؒ ہفتہ وار درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اب یہاں ان کے خلف الرشید ڈاکٹر عارف رشید ﷾ ہفتہ وار درس کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔ نیز دیگر پروگرام، سیمینارز وغیرہ کا انعقاد بھی یہیں ہوتا ہے۔ اس سے ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہوگئی، ورنہ اس طرح کے پروگراموں کے لیے شہر کے وسط میں ہال کرائے پر لینا پڑتے تھے۔

قرآن یونیورسٹی کا خواب

ڈاکٹر صاحبؒ نے ۱۹۶۸ء میں ایک قرآن یونیورسٹی کا خواب بھی دیکھا تھا، جس میں تمام علوم قرآن حکیم کے گرد گھومتے ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’یہ کام ظاہر ہے کہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک عالمِ اسلام میں جابجا ایسی یونیورسٹیاں قائم نہ ہوں جن میں ہر ایک کا اصل مرکزی شعبہ ’’تدبّرِ قرآن‘‘ کا ہو اور اس کے گرد تمام علومِ عقلی جیسے منطق، مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، نفسیات، الٰہیات اور علومِ عمرانی جیسے معاشیات، سیاسیات، قانون، اور علومِ طبیعی جیسے ریاضی، کیمیا، طبیعیات، ارضیات اور فلکیات وغیرہ کا ایک حصار قائم ہو، اور ہر ایک طالب علم ’’تدبّرِ قرآن‘‘ کی لازماً اور ایک یا اس سے زائد دوسرے علوم کی اپنے ذوق کے مطابق تحصیل کرے اور اس طرح ان شعبہ ہائے علوم میں قرآن کے علم و ہدایت کو تحقیقی طور پر اخذ کر کے مؤثر انداز میں پیش کر سکے۔‘‘

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کا یہ خواب تاحال پورا نہیں ہوا۔ ان کے تلامذہ اور فکری ورثاء پر بہت سے قرض باقی ہیں جو انہوں نے چکانے ہیں۔ ان کے فکر کی بہت سی تہیں ابھی کھلنی ہیں، کئی فکری گوشوں کو اُجاگر ہونا ہے۔ ان کا بہت سا فکری کام ماہنامہ ’’میثاق‘‘ اور سہ ماہی ’’حکمتِ قرآن‘‘ کے صفحات میں بکھرا پڑا ہے جسے مرتب و مدوّن کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحبؒ کے قرآنی افکار ہزاروں کی تعداد میں آڈیو/ویڈیو خطابات کی صورت میں محفوظ ہیں، جنہیں کتابی شکل میں لانا باقی ہے۔ خطابات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، یہ دعوت کا انتہائی مؤثر ذریعہ ہیں لیکن ان کی اہمیت وہ نہیں جو کتاب کی ہوتی ہے۔ کسی بھی بڑے مفکر، دانشور، ادیب اور اسکالر کے افکار کا حوالہ کتب ہوتی ہیں، لہٰذا ڈاکٹر صاحبؒ کے قرآنی افکار کا کتابی شکل میں مدوّن ہونا باقی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحبؒ فرد واحد کی حیثیت سے کام کا آغاز کر کے ’’رجوع الی

القرآن'' کی اتنی عظیم تحریک برپا کر سکتے ہیں تو کیا اتنے سارے ادارے' افراد اور وافر وسائل اس کام میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے؟ یہ ایک سوال ہے جو مجھ سمیت ان تمام لوگوں کو دعوتِ فکر دیتا ہے جو ڈاکٹر صاحبؒ کے فکر کے امین اور خوشہ چیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحبؒ کی مساعی جمیلہ کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور انہیں جنّت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ آمین!

وفات

۱۳/اپریل کو رات ساڑھے گیارہ بجے ڈاکٹر عارف رشید نے محسوس کیا کہ والد محترم کی طبیعت مضمحل ہے اور کمر کی تکلیف شدت اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحبؒ کے معالج ملک کے نامور سرجن ڈاکٹر عامر عزیز سے رابطہ کیا گیا۔ وہ تشریف لائے اور ضروری ادویات تجویز کیں۔ طبیعت مزید مضمحل ہوئی تو ہسپتال لے جانے کا سوچا گیا' لیکن ڈاکٹر صاحبؒ نے منع کر دیا۔ رات ڈھائی بجے ڈاکٹر صاحبؒ کے خادم نے محسوس کیا کہ آپ کی سانس کی آواز نہیں آ رہی۔ قریب جا کر دیکھا تو آپ ساکت وساکن تھے۔ خادم نے فوری طور پر ڈاکٹر عارف رشید کو اطلاع دی۔ اُنہوں نے ڈاکٹر صاحبؒ کا معائنہ کیا اور بتایا کہ اللہ کے دین کا خادم اللہ کے پاس پہنچ گیا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندے پر کرم کیا اور اُس پر موت کی سختیوں کو آسان فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی خدمت والی زندگی اور راحت والی موت عطا فرمائے۔ آمین!

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی نماز جنازہ بعد نماز عصر وسیع وعریض ماڈل ٹاؤن پارک میں ادا کی گئی' جس میں مولانا محمد رفیع عثمانی' مولانا سمیع الحق' مولانا فضل رحیم' مولانا زاہد الراشدی' مولانا عبدالمالک' حافظ حسین احمد' مولانا محمد حنیف جالندھری' مولانا طاہر اشرفی سمیت ملک بھر سے آئے ہوئے سینکڑوں علماء کرام نے شرکت کی۔ قاضی حسین احمد' سید منور حسن اور جماعت اسلامی کے دیگر قائدین اور ارکان کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ نماز جنازہ کا اجتماع لاہور کی تاریخ کے بڑے جنازوں میں سے ایک تھا۔ نماز جنازہ آپ کے فرزند ارجمند حافظ عاکف سعید نے پڑھائی۔

عظیم شخصیت کے بارے میں عظیم شخصیات کے تاثرات

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے بارے میں ملکی اور غیر ملکی معروف شخصیات کے کیا تاثرات ہیں' آیئے جائزہ لیتے ہیں:

فرزند اقبال جسٹس جاوید اقبال کہتے ہیں:

''میری ڈاکٹر اسرار احمد سے گہری وابستگی رہی ہے۔ ہم اکثر ٹی وی چینلز پر اظہارِ خیال کے لیے اکٹھے مدعو کیے جاتے تھے۔ وہ مجھ سے بہت ہی محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ میں نے ایک دو دفعہ قرآن اکیڈمی میں بھی ان سے ملاقات کی۔ وہ احیائے خلافت کے حوالے سے بہت ہی ''کلیئر ہیڈڈ'' تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ نظامِ خلافت لازمی رائج ہو کر رہے گا۔ جب ایک فریق اپنے موقف پر اتنا convinced ہو تو اس پر بات کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ قرآن کی تفسیر کو عام فہم انداز میں بیان کرتے تھے۔ خلافت کا تصور ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے جبکہ میرا موضوع اسلام کا سیاسی فلسفہ رہا ہے۔ ان موضوعات پر اکثر ہمارے بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔''

معروف اسلامی اسکالر جاوید احمد غامدی فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر اسرار احمد اسلام اور مسلمانوں کی متاعِ عزیز تھے۔ وہ ایک وسیع المطالعہ شخصیت تھے۔ انہوں نے جس انداز میں اپنی زندگی کا ایک مقصد متعین کیا اور پھر پوری استقامت اور عزیمت کے ساتھ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی پوری زندگی بسر کی وہ ہمارے لیے بہترین مثال ہے۔ وہ جدید وقدیم علوم پر گہری نظر رکھتے اور اپنی بات بڑے سلیقے سے کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ ہمارے ہاں بہت کم لوگ اتنے شائستہ اور اتنے اعلیٰ اسلوب میں اپنا مدعا بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو دی تھی۔ انہوں نے پوری کوشش کی کہ جس دینی تصور کو وہ درست سمجھتے تھے اِسے لوگوں کے ذہن میں اتاریں' اس کے مطابق ان کی تربیت کریں۔ اس کے لیے انہوں نے ایک بڑی تنظیم بھی قائم کی۔ اس لحاظ سے وہ بڑی ہمہ جہت شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی عظیم مقصد کی نذر کر دیا۔ ان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ جو کچھ صحیح سمجھتے تھے اسے برملا کہتے تھے۔ اس میں ادنیٰ درجے کی بھی کوئی مداہنت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں اور اہل خاندان کو بھی اسی مسلک کا پابند کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے رجوع الی القرآن کی ایک تحریک برپا کیے رکھی۔ بلکہ مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ جس زمانے میں ہم لوگ طالب علم تھے' یہ معلوم ہوتا تھا کہ قرآن مجید کی منادی کرنے والا ایک شخص پیدا ہو گیا ہے جو صبح شام اس کی جانب لوگوں کی توجہ دلاتا ہے کہ لوگو! اللہ کی کتاب کی طرف آؤ' اللہ کی کتاب کو مضبوطی

کے ساتھ پکڑو‘ اس کو سمجھو‘ اس میں تدبر کرو‘ اپنی زندگی اس کے مطابق تبدیل کرنے کی کوشش کرو۔ ان کا ایک بہت ہی اچھا کتابچہ ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ ’’مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق‘‘ کیا ہیں۔ میرے نزدیک ان کی تحریروں میں وہ بہترین تحریر ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی جامعیت کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ مجھے ان کے نقطہ ہائے نظر سے شدید اختلاف رہا ہے‘ لیکن یہ بالکل الگ چیز ہے۔ اپنے نقطۂ نظر پر استقامت میں وہ ایک بے نظیر شخصیت تھے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہم اسلام اور مسلمانوں کی ایک متاعِ عزیز سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کی محرومی ہم سب کی محرومی ہے اور ان کا غم ہم سب کا غم ہے۔ میں ملک سے باہر تھا‘ جس کی وجہ سے ان کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔ اس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ میرے دل میں ان کی بے پناہ عزت ہے۔ وہ میرے محسن اور بزرگوں میں سے تھے۔ میں ان سے بڑی محبت رکھتا تھا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی اپنے نقطۂ نظر سے کتنی محبت رکھتا تھا۔ اس کی صحت پر اسے کیسا یقین و ایمان تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ ان کا بغض اور ان کی محبت سب اسی نقطۂ نظر کے تحت ہوتی تھی۔‘‘

ڈاکٹر عبدالکریم ذاکر نائیک فرماتے ہیں:

’’میرے نزدیک ڈاکٹر اسرار احمد اردو زبان کے سب سے بہترین مفسرِ قرآن تھے۔ میں ان کی اردو تقریر کا بڑا فین ہوں۔ میرے نزدیک ’’پیس‘‘ ٹی وی پر جتنے اردو مقررین ہیں ان سب سے بہترین ڈاکٹر اسرار احمدؒ تھے۔ میں الحمدللہ ۱۹۹۱ء میں ان سے ملا تھا۔ اس وقت سے ہمارے ان کے ساتھ تعلقات ہیں اور میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ میں شیخ احمد دیداتؒ اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے متاثر ہو کر دعوت کے میدان میں آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہدایت کی تھی کہ آپ میڈیسن اور دعوت میں سے کسی ایک فیلڈ کو اپنے لیے چن لیں۔ آپ بیک وقت دونوں میں اسپیشلائز نہیں کر سکتے۔ میں نے سوچا کہ دعوتی میدان میں اسپیشلائز کرنا بہتر ہے۔ ہم نے ۲۰۰۵ء میں محترم ڈاکٹر صاحب کو بمبئی بلایا تھا اور ہمارے پاس جو وسائل اور ٹیکنالوجی میسر تھی اس سے ڈاکٹر صاحب کے لیکچرز کی ریکارڈنگ کی تھی۔ ۲۰۰۸ء میں ہم ’’پیس‘‘ ٹی وی کے لیے پورے قرآن پاک کی ریکارڈنگ کرنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ملکی حالات اچھے نہ

ہونے کے سبب وہ پروگرام کینسل ہو گیا اور اب جولائی ۲۰۱۰ء میں پورا ایک مہینہ ڈاکٹر صاحب کے لیکچرز ریکارڈ کرنے کا پروگرام تھا‘ لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ایسا منظور نہیں تھا۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ ہمارے پاس جتنی بھی پرانی ریکارڈنگز موجود ہیں اس کو جدید ٹیکنالوجی سے improve کر کے Peace TV پر لائیں۔‘‘

اخبارات اور تعزیتی بیانات

’’ممتاز عالم دین‘ معروف اسکالر اور تنظیم اسلامی کے بانی ڈاکٹر اسرار احمد لاہور میں انتقال کر گئے۔ مرحوم طویل عرصے سے کمر کے درد اور دل کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ منگل اور بدھ کی درمیانی شب کو ان کی کمر میں شدید درد ہوا جس پر انہیں ہسپتال لے جانے کا کہا گیا‘ لیکن ڈاکٹر اسرار احمد نے منع کر دیا جس پر ڈاکٹر عامر عزیز نے گھر پر آ کر ان کا چیک اَپ کیا۔ صبح ساڑھے تین بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ڈاکٹر صاحب کے دروس اور فہم قرآن دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ وہ زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ ہوئے اور اس کے ناظم اعلیٰ بھی رہے۔ بعد ازاں وہ جماعت اسلامی سے وابستہ ہوئے‘ تاہم بعض اختلافات کے بعد وہ جماعت سے علیحدہ ہو گئے اور تنظیم اسلامی کے نام سے اسلامی انقلابی جماعت کی بنیاد ڈالی۔ ان کی نماز جنازہ بعد از نماز عصر سنٹرل پارک ماڈل ٹاؤن میں ادا کی گئی‘ جس میں اہم سیاسی و مذہبی شخصیات‘ تنظیم اسلامی کے کارکنوں اور ان کے ہزاروں عقیدت مندوں نے شرکت کی۔ صدر آصف علی زرداری‘ وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی‘ وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف‘ مسلم لیگ (ن) کے قائد میاں نواز شریف‘ چیئرمین سینیٹ فاروق ایچ نائیک‘ ڈپٹی چیئرمین جان محمد جمالی‘ اسپیکر قومی اسمبلی فہمیدہ مرزا‘ ڈپٹی اسپیکر فیصل کریم کنڈی سمیت تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں کے قائدین نے ڈاکٹر اسرار احمد کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔‘‘ (ثناء نیوز‘ لاہور)

’’بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے انتقال پر ان کے بیٹوں کے ساتھ اظہارِ تعزیت کے لیے قرآن اکیڈمی میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے نمایاں افراد کا تانتا بندھا رہا۔ وفات کے دوسرے روز تعزیت کے لیے آنے والے نمایاں لوگوں میں میاں محمد شہباز شریف‘ مولانا امیر حمزہ‘ کے ایم اعظم‘ قاضی محمد یونس انور‘ حافظ عبدالرحمٰن مدنی‘ ارشاد احمد عارف‘ عطاء الحق قاسمی‘ مصطفیٰ صادق‘ جمیل اختر اور مولانا عبداللطیف شامل

ہیں۔'' (پریس ریلیز، تنظیم اسلامی)

''سینیٹ میں معروف اسلامی اسکالر ڈاکٹر اسرار احمد کے لیے دعائے مغفرت کروائی گئی۔ جماعت اسلامی کے پروفیسر خورشید احمد نے نکتہ اعتراض پر کہا کہ عالمِ اسلام کے معروف اسکالر اور مبلغ ڈاکٹر اسرار احمد کا انتقال ہوا ہے، سینٹ میں ان کے لیے دعائے مغفرت کرائی جائے۔ اس پر سینیٹر عبدالغفور حیدری نے ان کے لیے دعا کرائی۔''
(ثناء نیوز، اسلام آباد)

"One of the greatest scholars of Islam is physically no more with us in this world, but his eloquent and deeply impacted ideas, talks, writings and unmitigated work for Islam will always live on, forever with us, guiding, motivating and inspiring us to carry on his great work. His straight forward and yet articulate public talks and writings for a proper Islamic Renaissance have been a class apart, full of introspection and wisdom with deep insight. He was a rare scholar indeed! (Dr. Zakir Abdul Kareem Naik, IRF, Mumbai (India)

"I was deeply grieved to learn of the sad demise..... It is a very painful and sad moment.....'' (Waseem Sajjad, Leader of the opposition, Senate of Pakistan)

حرفِ آخر

ہم نے اس مطالعہ میں ملک کے معروف اسلامی اسکالر کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ تو اس وقت ہم میں موجود نہیں ہیں مگر ان کی تحاریر و تقاریر کا سرمایہ کثیر تعداد میں ہمارے پاس موجود ہے جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ ایک عبقری شخصیت اور اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی ایک صد سے زیادہ تصانیف ہیں۔ علاوہ ازیں لاتعداد آڈیو/ویڈیو خطابات کی شکل میں قیمتی اثاثہ ڈاکٹر صاحبؒ کی اصل میراث ہے۔

۱۹۹۴ء میں ڈاکٹر صاحبؒ کے قلم سے نکلنے والی کتاب ''حسابِ کم وبیش'' کی روشنی میں انہوں نے دُنیوی اعتبار سے کوئی میراث نہیں چھوڑی۔ جو تھوڑی بہت جمع پونجی تھی وہ سب بھی

انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے قیام سے قبل یا متصل بعد دین کے لیے وقف کر دی۔

ایسے مذہبی اسکالر، عالم، مہتمم، لیڈر خال خال ہی ملیں گے کہ جو پورے اعتماد کے ساتھ اس بات کا اظہار کریں کہ انہوں نے دنیا میں کیا کمایا اور کیا خرچ کیا۔ یہ ڈاکٹر صاحبؒ کا خاصہ تھا کہ جب بھی بات کی، پورے اعتماد اور دلائل کے ساتھ کی اور کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوئے۔ وقت کے حکمرانوں نے ہر دور میں ان کو خریدنے کی بھرپور کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کا شمار کلمۂ حق بابانگِ دہل کہنے والوں میں سرفہرست رہے گا۔ وہ قدامت پسندی اور جدیدیت کی اعلیٰ مثال تھے۔ تاریخ ہمیشہ انہیں ایک متوازن شخصیت کے طور پر یاد رکھے گی۔ مرزا غالب نے درست کہا کہ: ع ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!''

زیر نظر مطالعہ سے درج ذیل بنیادی مفروضات میں حقیقت کا رنگ بھر جاتا ہے:

ا: ڈاکٹر اسرار احمدؒ پاکستان و ہندوستان کے روایتی معاشرے اور اسلامی علوم کے ساتھ مغربی فکر و فلاسفہ کی آدرشوں کی تفہیم بھی رکھتے تھے۔

ب: ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسلامی نشأۃِ ثانیہ کو جدید دور میں ممکن سمجھتے تھے۔

ج: ڈاکٹر اسرار احمدؒ اسلامی اخلاق اور روحانیت کو برقرار رکھتے ہوئے سائنس و ٹیکنالوجی اور جدید سماجی علوم کی تحصیل کے ذریعہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے حصول کے خواہش مند تھے۔

د: ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا خیال تھا کہ اسلام نے اندلس میں علمی و سائنسی علوم کے فروغ کے ذریعے مغرب کو ترقی کی راہ دکھائی۔ بعد کے ادوار میں مسلم اُمّہ اپنے اس ورثے کی حفاظت نہ کر سکی۔ ترقی، آزادی اور مساوات دراصل اسلامی معاشرت و سیاست کی وہ صفات ہیں جنہیں مغرب نے اپنا کر عروج حاصل کر لیا۔

ہ: ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا خیال تھا کہ ترقی کے مغربی راستے کو اختیار کرنا اس کی تقلید نہیں بلکہ مسلم اُمّہ کی اپنی ہی متاعِ گم شدہ میراث کے حصول کی جستجو ہے۔ اقتدار و اختیار حاصل کیے بغیر ایسا ممکن نہیں۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحبؒ پر بے مثال عنایات کی بارش کر دی تھی۔ ان کی شخصیت قول و فعل میں مطابقت، اصولوں پر سختی سے عمل، کلمۂ حق کہنے کی زبردست جرأت، خودداری، قناعت، سادگی، استقامت، بے پناہ قوتِ عمل اور نیک مقاصد کے ساتھ سچی لگن سے آراستہ تھی۔

اُن کی زندگی پاکیزگی کا ایک انمول نمونہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ بچپن سے بڑھاپے تک قرآن حکیم و دینِ متین کی خدمت کی لائقِ تحسین داستان بنے رہے۔ زندگی کے آخری ساعتوں تک اللہ کی کتاب کی تبلیغ اور اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد ایک بہت بڑی سعادت ہے جو ڈاکٹر صاحبؒ کے حصہ میں آئی۔ ایسی زندگی بلاشبہ شیرازی کے اس شعر کا مصداق نظر آتی ہے: ؎

حاصل عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!

''میں نے اپنی زندگی کا کُل سرمایہ محبوب کی راہ میں نچھاور کر دیا۔ میں خوش ہوں اپنی بیتی ہوئی زندگی سے کہ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔''

سفارشات (Recommendations)

i) ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے پیش کردہ مختلف نظریات میں اتنی جان ہے کہ ایک ایک نظریہ کو لے کر اُس پر تحقیق کی جائے۔

ii) ڈاکٹر اسرار احمدؒ واقعتاً اپنی ذات میں انجمن تھے۔ لہٰذا ان کی شخصیت کو زیرِ تحقیق لایا جائے۔

iii) ڈاکٹر صاحب سے متعلق معاشرے میں جو غلط فہمیاں موجود ہیں انہیں اس مقالے کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے۔

iv) جو قومیں اپنے لیڈرز کی قدر نہیں کرتیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتیں۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے فرمایا تھا: ''اے ہندوالو! تم نے میری قدر نہیں کی۔'' لہٰذا ایسے عظیم لیڈر کی قدر کرنے کی طرف بھی پیشِ نظر مطالعہ میں اشارہ موجود ہے۔

مصادر و مراجع

(۱) مطبوعاتِ مرکزی انجمن خدام القرآن
i) تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ
ii) جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی
iii) فہرست مطبوعات
iv) عزمِ تنظیم

v) دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر
vi) وحدتِ اُمت   vii) بیان القرآن
viii) تعارف تنظیم اسلامی
ix) مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب
x) حزب اللہ کے اوصاف   xi) جہاد بالقرآن
xii) پاکستان میں نظامِ خلافت: کیا' کیوں' کیسے؟
xiii) اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام
xiv) مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
xv) تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر
۲) سالانہ رپورٹ (۲۰۱۰ء/۲۰۱۱ء) انجمن خدام القرآن' سندھ' کراچی
۳) تعارف قرآن کالج   ۴) ہفت روزہ ''ندائے خلافت''

[تشکر: مجلّہ الایضاح' شیخ زاید مرکز اسلامی' جامعہ پشاور' جون ۲۰۱۸ء]
http://www.al-idah.pk/index.php/al-idah/issue/view/18

بقیہ: حقیقتِ ایمان

[رواہ البیھقی فی ''دلائل النبوۃ'' بحوالہ مشکاۃ المصابیح' کتاب المناقب' باب ثواب ھذہ الامۃ]

افضل ایمان تو یقیناً صحابہ کرام ؓ ہی کا ہے لیکن اس حدیث میں بعد والوں کے ایمان کی قدر افزائی اَعْجَب کہہ کر کی گئی ہے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آج ایمانی حقائق سے متعلق جو کچھ بھی بیان ہوا ہے' ہمیں بھی اُس کے اعتبار سے کچھ حصہ عطا فرمائے۔ آمین!

اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ اِلَیْنَا الْاِیْمَانَ وَزَیِّنْہُ فِیْ قُلُوْبِنَا وَکَرِّہْ اِلَیْنَا الْکُفْرَ
وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ، وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِیْنَ

[آج کی نشست میں سات ابواب سے متعلق گفتگو مکمل کی گئی۔ دو ابواب (۷'۸) تفصیل طلب ہیں جو بعد میں زیر بحث آئیں گے۔ ان شاء اللہ!]

حرفِ بدرا برلب آوردن خطاست!

ایوب بیگ مرزا

ایک زمانہ تھا جب رضا شاہ پہلوی ایران کا بادشاہ تھا۔ امریکہ اور ایران کے تعلقات مثالی تھے۔ امریکہ اور سوویت یونین دو حقیقی عالمی قوتیں تھیں۔ دنیا کے اکثر ممالک ان دو سپر قوتوں کے حلیفوں میں بٹے ہوئے تھے۔ امریکہ کا پلّہ اُس وقت بھی قدرے بھاری تھا لیکن سوویت یونین کی پھنکار سے بھی اکثر ممالک سہمے رہتے تھے۔ جنوبی ایشیا میں بھارت کا جھکاؤ سوویت یونین کی طرف تھا لیکن اس نے غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ پاکستان کے امریکہ سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ ''سیٹو'' اور ''سینٹو'' کا رُکن بھی تھا' لیکن امریکہ کی قربت کے حوالے سے جو حیثیت ایران کو حاصل تھی وہ کسی کو نہ تھی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امریکہ نے اس خطے کی چودھراہٹ ایران کو دے رکھی تھی۔ گویا وہ خطے میں امریکہ کا نمائندہ اور اس کا مقرر کردہ تھانیدار تھا۔ داخلی سطح پر رضا شاہ پہلوی کا ایران پر مکمل اور غیر متنازعہ کنٹرول تھا۔ ایران کے روحانی رہنما آیت اللہ خمینی کی حیثیت اپوزیشن لیڈر کی تھی لیکن ان کا ایران میں رہنا مشکل ہوگیا تھا تو وہ فرانس ہجرت کر گئے اور وہاں سے اسلام اور اسلامی انقلاب کے حوالے سے اپنی تقاریر ریکارڈ کر کے خفیہ طور پر ایران بھجواتے رہے۔

رضا شاہ کے تکبر کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی کو گھاس ڈالنے کو تیار نہ تھا۔ داخلی طور پر ملک میں اپنے کنٹرول اور بیرونی دنیا میں امریکہ کی سرپرستی اور کھلی حمایت نے اُس کی رعونت بلکہ فرعونیت میں بڑا اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اپنا تعلق اسلام سے نہیں بلکہ سائرس اعظم سے جوڑتے ہوئے اپنی حکومت کو اس شہنشاہیت سے منسلک کرتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جب اسلامی سربراہانِ مملکت کا لاہور میں اجتماع بلایا تو امریکہ کے اشارے پر رضا شاہ پہلوی نے شرکت سے انکار کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ذاتی رابطہ کر کے پاکستان آنے کا بڑا اصرار کیا لیکن رضا شاہ پہلوی راضی نہ

ہوا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے اس نے ڈھائی ہزار سالہ ایرانی شہنشاہیت کا جشن منایا تھا' جس میں دنیا کے تمام سربراہوں کو مدعو کیا۔ اس مقصد کے لیے تہران کے قریب خاص طور پر ایک نیا شہر بسایا گیا۔ پاکستان کی طرف سے اس وقت کے صدر یحییٰ خان شریک ہوئے۔ اس فنکشن میں شراب و کباب اور عیش وعشرت کا بھرپور سامان کیا گیا۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا گیا۔ امریکہ کے نائب صدر بھی ایک بڑے وفد کے ساتھ شریک ہوئے۔ دنیا کے سامنے ایرانی شہنشاہیت کا بھرپور اظہار کیا گیا۔

رضا شاہ پہلوی نہیں جانتا تھا کہ امام خمینی کے فرانس سے ایران آنے والے کیسٹ ایرانی عوام کے اذہان وقلوب میں کس قدر رچ بس گئے ہیں' اور ان کے اندر ایک ایسا جذبہ مچل رہا ہے جو کسی وقت بھی طوفان کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ پھر وہی ہوا۔ عوام ظاہری طور پر ایرانی حکومت اور حقیقی طور پر رضا شاہ پہلوی کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے اور احتجاج شروع کر دیا۔ شاہ نے بدترین ظلم وتشدد کیا۔ ہزاروں شہریوں کو ہلاک کر دیا۔ وہ بار بار وزیر اعظم بدل رہا تھا اور ظلم کو ناقابلِ بیان حد تک بڑھا رہا تھا۔ لوگ گولیاں کھا کر بھی پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ شہریوں کی طرف سے اکثر عدم تشدد کا مظاہرہ ہوا۔ امریکہ نے جب دیکھا کہ ہمارا گھوڑا بری طرح پٹ رہا ہے اور اس کے بچنے کے امکانات محدود ہو چکے ہیں تو اس نے بھی اپنی سرشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہ کو دھتکار دیا۔ یہاں تک کہ جب رضا شاہ پہلوی ایران سے جان بچا کر بھاگا تو امریکہ نے اپنے اس وفادار غلام کو پناہ دینے سے بھی انکار کر دیا۔ چنانچہ اس نے مصر میں پناہ لی۔ شاہ بیمار پڑ گیا تو امریکہ نے علاج کے لیے بھی اسے اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دی۔ وہ مصر کے ایک ہسپتال میں بے بسی کے عالم میں دم توڑ گیا۔

ایران اور امریکہ کی جنگ کے حوالے سے لکھنے سے پہلے راقم نے یہ ابتدائیہ اس لیے لکھا ہے کہ قارئین کے سامنے ان حکمرانوں کا انجام بھی آ جائے جو اپنے عوام پر ظلم وستم توڑتے ہیں' اور ایران کے عوام کا عزم بھی سامنے آ جائے کہ جب وہ کسی بات پر ڈٹ جائیں تو کس طرح اپنی جان قربان کر دیتے ہیں لیکن پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتے۔ حقیقت میں یہ غلط ہے یا درست' ایرانی بہرحال قوم پرست ہیں۔ مناسب ہوگا کہ ایران کی قوم پرستی کی ایک دو اور مثالیں قارئین کے سامنے رکھی جائیں۔ پہلی یہ کہ اس جنگ سے پہلے آیت اللہ خامنہ ای کی مذہبی حکومت کے

خلاف مظاہرے اتنی بڑی سطح پر ہو رہے تھے کہ شاہ کے خلاف ہونے والے مظاہروں کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔ جونہی امریکہ اور اسرائیل نے ایران پر حملہ کیا بلکہ حملے کے آثار ہی پیدا ہوئے تھے تو مخالفانہ مظاہرے حکومت کے حق میں تبدیل ہوگئے۔ ایرانی عوام نے متحد ہوکر بیرونی حملہ آور کے خلاف محاذ بنالیا اور ریاست کے لیے ایک حفاظتی قلعہ کی صورت اختیار کر لی۔ پھر جب سیز فائر سے پہلے صدر ٹرمپ نے ایران کے بجلی گھر اور پل تباہ کرنے کی دھمکی دی تو ایرانی اپنے بجلی گھروں کے گرد انسانی زنجیر بنا کر کھڑے ہو گئے کہ آؤ پہلے ہمیں مارو۔ قِصّہ کوتاہ‘ امریکہ کے خطرناک و تباہ کن اسلحہ بارود کو ایرانیوں نے اپنے جذبے سے پسپا کر دیا۔ نیتن یاہو نے صدر ٹرمپ کو جو یہ سبق پڑھایا تھا کہ زبردست بمباری کے پہلے ہی ہلے میں اگر موجودہ ایرانی سیاسی اور عسکری لیڈرشپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تو ایرانی فوراً اپنی حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے اور ہم ایران کو تر نوالہ بنا کر نگل جائیں گے‘ یہ اندازہ اتنا غلط ثابت ہوا کہ لفظ غلط بھی اتنا غلط نہیں جتنا یہ فلسفہ غلط ثابت ہوا۔ امریکہ کی پسپائی اور اسرائیل کی دھلائی تو ہوئی‘ بے چارے عرب جو جنگ کے نام سے ہی بستر میں گھس جاتے ہیں ان کی بھی ایران کے ہاتھوں ایسی درگت بنی کہ دنیا نے خوب تماشا دیکھا۔

امریکہ نے تو اپنے وفادار رضا شاہ پہلوی کو دھتکار کر ایران کی نئی انقلابی حکومت کو ایک مثبت پیغام دیا تھا لیکن امام خمینی کے وزیر ابراہیم یُزدی نے القدس ریلی نکال کر فلسطینیوں کی حمایت کر ڈالی‘ جس پر اسرائیل غصے سے بے قابو ہوگیا۔ یوں امریکہ بھی اپنے اس لے پالک کی وجہ سے امام خمینی کی حکومت کا شدت سے مخالف ہوگیا۔ یہ ہے وہ کشیدگی جو ۱۹۷۹ء سے اب تک نہ صرف ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی بلکہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ گزشتہ چند ماہ میں دوسری مرتبہ جنگ کا میدان گرم ہوا ہے۔ نیتن یاہو نے سابق امریکی صدور خاص طور پر بارک اوباما کے سامنے اس انداز میں یہ بات رکھی تھی اور انہیں طویل لیکچر دیے تھے کہ ایران پر حملہ کرنا کیوں بہت ضروری ہے‘ لیکن ٹرمپ سے پہلے کوئی صدر اس حماقت پر آمادہ نہ ہوا۔ یہ تو ایک کھلا راز ہے کہ امریکہ میں صدارت کے لیے ڈیموکریٹک امیدوار ہو یا ری پبلکن‘ جب تک وہ اسرائیل سے اپنی صدارتی امیدواری کی سند حاصل نہ کر لے اس کے امریکی صدر منتخب ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ ٹرمپ جب ری پبلکن پارٹی کی طرف سے صدارتی امیدوار بنا تو اس

نے اسرائیل کا ایک خفیہ دورہ کیا۔ دنیا کی خبر رساں ایجنسیاں اس بات پر متفق ہیں کہ آج جو کچھ صدر ٹرمپ اسرائیل کے لیے کر رہا ہے یہ سب کچھ اُس دورے میں طے ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صہیونی تنظیم جو ۱۹ ویں صدی کے آخر میں اسرائیل کے قیام کے حوالے سے متحرک ہوئی تھی اور جس نے دو عالمی جنگیں کروا کر طاقت کے مرکز کو لندن سے واشنگٹن منتقل کیا تھا‘ اس کا اب ہدف گریٹر اسرائیل کے قیام اور واشنگٹن سے عالمی طاقت کے مرکز کو تل ابیب بلکہ یروشلم منتقل کرنا ہے۔ لہٰذا اس وقت دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے‘ مثلاً امریکہ اسرائیل کا ایران پر حملہ کرنا‘ پاک بھارت جنگ‘ بھارت کے وزیراعظم مودی کا اسرائیل کا دورہ‘ یہ سب کچھ ایک پلان کے تحت ہو رہا ہے تاکہ صہیونی تحریک اپنے طے شدہ اہداف کو حاصل کر سکے۔ ٹرمپ صدر تو امریکہ کا ہے لیکن صہیونیوں کے کنٹرول میں ہے۔ وہ بندوق کی نوک پر صدر ٹرمپ کو اس راستے پر چلا رہے ہیں۔ یہ سفر طے کرنے میں ان کے سامنے فوری رکاوٹ ایران ہے۔ یہاں انہیں کچھ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ غلطی ایران کی جنگی صلاحیت کو سمجھنے میں ہوئی‘ جبکہ اصل اور بڑی غلطی ایرانیوں کے جذبہ حریت کو سمجھنے اور تولنے میں لگی۔

پھر یہ کہ یورپ جو امریکہ کا فطری اتحادی سمجھا جاتا ہے‘ اس نے نہ صرف امریکہ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا بلکہ امریکی اور اسرائیلی حملے کو ناجائز قرار دیا۔ صدر ٹرمپ نے ’’نیٹو‘‘ کو بھی پکارا لیکن اس نے بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ طعن کرنے پر اُتر آیا اور کہا کہ نیٹو ممالک نے ہمارا اتنا مال کھایا ہے لیکن وقت پڑنے پر ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اس نے سب سے عجیب و غریب حرکت یہ کی کہ پوپ جس کا امریکہ سے تعلق ہے‘ اسے بھی بے نقط سنا دیں‘ حالانکہ عیسائی دنیا میں اسے ایک مقدس شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جنگ کے نتائج چونکہ صدر ٹرمپ کی توقعات کے مطابق نہیں آ رہے تھے‘ لہٰذا وہ بری طرح بوکھلا گیا اور ایسی غلیظ زبان کا استعمال کیا جو کسی مملکت کے صدر کو تو کیا‘ کسی عام شخص کو بھی زیب نہیں دیتی۔ بالآخر ایران کو الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اگر اس نے سات اپریل تک آبنائے ہرمز نہ کھولی تو اس کا انفراسٹرکچر اور بجلی کا نظام تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ البتہ الٹی میٹم ختم ہونے سے پہلے پاکستان کی کوششوں سے یہ اعلان ہو گیا کہ دو ہفتے کی سیز فائر ہوگی اور اس دوران اسلام آباد میں فریقین کے مذاکرات ہوں گے۔ یہ پاکستان کے لیے یقیناً بہت بڑا اعزاز تھا۔ مذاکرات کے حوالے سے امریکہ نے پانچ

نکات اور ایران نے دس نکات پیش کیے:

(۱) جوہری پروگرام پر پابندیوں کو قبول کیا جائے۔

(۲) معاشی پابندیاں برقرار رہیں گی۔

(۳) چین کے ساتھ تعلقات محدود رکھے جائیں۔

(۴) افغان طالبان کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔

(۵) میزائل پروگرام اور خطے میں سرگرمیوں پر پابندیاں

ایران کی شرائط:

(۱) تمام فریقین کی جانب سے فوری‘ غیر مشروط اور مکمل جنگ بندی تاکہ مزید جانی و مالی نقصان نہ ہو۔

(۲) امریکہ خطے خصوصاً مشرق وسطیٰ سے اپنی فوجی موجودگی ختم یا نمایاں حد تک کم کرے۔

(۳) ایران پر عائد تمام اقتصادی پابندیوں کو مکمل طور پر اٹھایا جائے تاکہ اس کی معیشت بحال ہو سکے۔

(۴) پُرامن جوہری پروگرام کے حق کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جائے جو کہ IAEA کے اصولوں کے تحت ممکن ہے۔

(۵) امریکہ اور اس کے اتحادی ایران کو یہ یقین دہانی کرائیں کہ مستقبل میں ایران پر حملہ نہیں ہوگا۔

(۶) اسرائیل کو ایران اور اس کے اتحادیوں کے خلاف کارروائیوں سے روکا جائے۔

(۷) آبنائے ہرمز میں جہاز رانی کی محفوظ اور بلا رکاوٹ آزادی کو یقینی بنایا جائے۔

(۸) فریقین کے درمیان قیدیوں اور زیر حراست افراد کا تبادلہ کیا جائے۔

(۹) خطے کے ممالک کی خودمختاری اور اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کو یقینی بنایا جائے۔

(۱۰) ایک باقاعدہ اور مستقل سفارتی مذاکراتی نظام قائم کیا جائے‘ جس میں ثالثی کردار پاکستان جیسے ممالک ادا کر سکیں تاکہ مستقبل کے تنازعات کو پُرامن طریقے سے حل کیا جا سکے۔

مذاکرات شروع ہوئے۔ امریکہ کی طرف سے نائب صدر جے ڈی وینس‘ وزیر جنگ وٹکاف اور ٹرمپ کا داماد جیرڈ کشنر شریک ہوئے۔ ایران کی طرف سے سپیکر اسمبلی محمد باقر

قالیباف اور وزیر خارجہ عباس عراقچی شریک ہوئے۔ وقفوں کو نکال دیں تو ۱۵ گھنٹے مسلسل مذاکرات ہوئے۔ ۱۲ اپریل صبح ۳:۵۰ پر امریکی نائب صدر نے امریکی صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اچھی خبر یہ ہے کہ ایران کے ساتھ ہم ایک میز پر بیٹھے اور بات چیت ہوئی‘ بعض نکات پر اتفاق ہوا‘ لیکن بری خبر یہ ہے کہ کوئی معاہدہ نہیں ہو سکا‘ کیونکہ ایران ہمیں کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکا کہ وہ ایٹم بم نہیں بنائے گا۔ لہٰذا مذاکرات ختم کر دیے گئے۔ اس کے بعد وہ اپنے جہاز کے ذریعے امریکہ واپس روانہ ہو گئے۔ امریکیوں کے اس طرزِ عمل اور بعض دوسرے عوامل نے ان مذاکرات کے انعقاد کے حوالے سے پھر سے چند سوالات اٹھا دیے ہیں‘ جو ہم قارئین کے سامنے لانا چاہیں گے:

(۱) جنگ سے پہلے عمان میں مذاکرات ہو رہے تھے‘ لیکن اسی دوران امریکہ اور اسرائیل نے ایران پر حملہ کر دیا تھا۔ مذاکرات کے بارے میں عمان نے واشگاف الفاظ میں بتایا کہ ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے حوالے سے ایران امریکہ کے مطالبات پر بڑا مثبت جواب دے رہا تھا‘ یہاں تک کہ یورینیم کی مزید افزودگی نہ کرنے پر متفق جبکہ موجودہ ذخائر کسی تیسرے ملک کے حوالے کرنے پر رضامند ہو گیا تھا۔

(۲) اگر مذاکرات یوں آگے بڑھ رہے تھے اور ایران اکثر مطالبات مان رہا تھا تو پھر مذاکرات کے درمیان ہی ایران پر حملہ کیوں کر دیا گیا؟

(۳) امریکی صدر کہتے ہیں کہ باقی معاملات پر تو اتفاق ہو رہا تھا اور یورینیم افزودہ کرنے کے بارے میں ایران جنگ سے پہلے ہی اتفاق کر رہا تھا تو اسلام آباد مذاکرات میں یہ کہنے کا جواز کیسے پیدا ہو گیا کہ چونکہ ایٹمی صلاحیت کے حوالے سے ایران مطالبہ تسلیم نہیں کر رہا لہٰذا مذاکرات ناکام ہو گئے؟

(۴) اسلام آباد مذاکرات کے دوران ہی سعودی عرب نے یہ انکشاف کیوں کر دیا کہ پاکستان کے جنگی جہاز اور فوجی سعودی عرب پہنچ گئے ہیں اور انہیں سعودی عرب کے مشرق میں العزیز ایئر بیس میں متعین کیا گیا جس کا رخ ایران کی سرزمین کی طرف ہے؟ گویا اسلام آباد مذاکرات کے شروع ہوتے ہی سعودی عرب اور پاکستان کو معلوم تھا کہ مذاکرات کامیاب نہیں ہوں گے۔ اگر یہ روٹین کا مسئلہ تھا تو ایک دن انتظار کر کے اور مذاکرات کے ختم

ہونے کے فوری بعد کیا جاسکتا تھا۔ پھر یہ کہ ساتھ ہی ایک خبر رساں ایجنسی نے یہ خبر دے دی کہ سعودی عرب سٹیٹ بنک آف پاکستان میں مزید پانچ ارب ڈالر بطور امانت رکھوائے گا۔ سعودی عرب سے پاکستان کے تعلقات کا اس سطح پر پہنچنا کہ پاکستان وہاں زمینی اور فضائی فوج بھیجے' اگرچہ بڑا مثبت اور فائدہ مند نظر آتا ہے لیکن اس میں بعض خطرات بھی پنہاں ہیں' جن کا فی الحال ذکر کرنا مناسب نہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں برادر ممالک کے لیے اس سے خیر برآمد کرے۔ آمین!

راقم کی رائے میں مذاکرات کا کامیاب نہ ہونا ایک طے شدہ مسئلہ تھا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ کو مذاکرات کا یہ ڈھونگ رچانے کی آخر ضرورت کیا تھی؟ راقم کی رائے میں دو وجوہات تھیں۔ پہلی یہ کہ اسے جنگ میں کچھ وقفے کی ضرورت تھی۔ اس نے سیز فائر کر کے اور مذاکرات کا سلسلہ شروع کروا کے مطلوبہ وقفہ حاصل کر لیا تا کہ وہ نئی منصوبہ بندی کے ساتھ اپنے اہداف کی طرف پیش رفت کر سکے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایران پر جنگ مسلط کرنے پر اندرونِ ملک ٹرمپ حکومت سخت تنقید کی زد میں تھی۔ مذاکرات سے یہ تاثر دینا مطلوب تھا کہ ہم تو ابھی بھی پُرامن طریقے سے مذاکرات کے ذریعے تنازع ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک اضافی کام یہ کیا گیا کہ مذاکرات کی ناکامی کا سبب خوامخواہ ایران کا ایٹم بم قرار دے دیا۔ یہ گویا یورپ کو ساتھ ملانے کی ایک کوشش ہے' اس لیے کہ ایران کی ایٹمی صلاحیت یورپ کو بھی کسی طرح قبول نہیں۔ اب امریکہ ایک طرف یہ جھوٹی بات پھیلا رہا ہے کہ امن کی بات چیت ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی جبکہ دوسری طرف جس آبنائے ہرمز کو کھلوانے کے دن رات دعوے کر رہا تھا' اس کو خود اس طرح بند کر دیا ہے کہ ایران کے لیے بھی اپنا تیل فروخت کرنا شاید ناممکن ہو جائے۔ اب ایران اگر آبنائے ہرمز کے ذریعے اپنے یا اپنے دوستوں کے جہاز گزارنا چاہے گا تو جنگ ہوگی اور امریکہ اس کا الزام ایران پر لگائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ امن کے حوالے سے سمجھوتا یا جنگ کو مستقل ختم کرنا کسی طرح بھی امریکہ کے ایجنڈے پر موجود نہیں۔ وہ ہر صورت ایران کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ یہی صہیونیوں کا بھی اصل پروگرام ہے جو وہ امریکی صدر ٹرمپ کے ذریعے آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ ہر قسم کے مذاکرات محض ڈھکوسلا تھے' کسی صورت امریکہ کو مطلوب ہی نہ تھے۔

تازہ ترین حالات نے معاملات کا ایک اور زاویہ واضح کر دیا ہے۔ ایران نے جب

آبنائے ہرمز کو بند کیا تھا تو چین کو یہ سہولت حاصل تھی کہ اس کے جہاز آ جا رہے تھے۔ اب امریکہ اسے مکمل طور پر بند کر کے چین کو بھی جنگ میں گھسیٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ماضی میں بھی مختلف اوقات میں امریکہ چین کو اشتعال دلا کر جنگ میں گھسیٹنے کی کوشش کر چکا ہے لیکن وہ ہر مرتبہ یہ کوشش ناکام بنا دیتا تھا۔ امریکہ بار بار چین کو جنگ میں کیوں گھسیٹنا چاہتا تھا؟ امریکہ سمجھتا تھا کہ چین جو اقتصادی اور معاشی جن بن چکا ہے اور عسکری معاملات میں بھی بڑی روانی سے آگے بڑھ رہا ہے' اسے فوری طور پر اگر نہ روکا گیا تو بعد میں ایسا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ امریکہ اپنے اہداف اسی جنگ کو بہانہ بنا کر حاصل کرنا چاہتا ہو۔ راقم کی رائے میں اگر حالیہ جنگ میں امریکہ اور اس کی راہنمائی کرنے والے صہیونیوں کو بڑا دھچکا لگ گیا اور انہیں محسوس ہوگیا کہ فی الحال وہ جنگ کے ذریعے اپنے اہداف حاصل نہیں کر سکتے تو دوبارہ مذاکرات کا ڈول ڈالا جا سکتا ہے' جن میں امن کے حقیقی قیام کی کوشش کی جائے گی۔ اسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ اس آگ کو پھیلانے سے باز رہیں' وگرنہ صہیونی اپنی خواہشات کی تکمیل میں دنیا کو بھسم کرنے کو تیار نظر آتے ہیں۔

یہ تحریر اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی کہ میڈیا میں صدر ٹرمپ کا بیان سامنے آیا کہ ایران نے ہمارے تمام مطالبات تسلیم کر لیے ہیں اور قوی امکان ہے کہ ڈیل ہو جائے گی' تب میں (ٹرمپ) ڈیل پر دستخط کرنے پاکستان جا سکتا ہوں۔ اگرچہ امریکی صدر کی کسی بات پر پوری طرح یقین تو نہیں کیا جا سکتا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اب کوئی ڈیل ہو جائے گی۔ البتہ راقم کو اس بات پر اصرار ہے کہ یہ جنگ میں ہفتوں کے بجائے کچھ ماہ کے وقفہ کا معاملہ ہوگا کیونکہ امریکہ اور اسرائیل کو اس جنگ میں غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ آئندہ ان سارے حالات اور معاملات کو مدِّنظر رکھ کر اپنے جنگی اہداف کو حاصل کرنے کی کوشش ہوگی۔ بہر حال اس وقت جو صورت حال راقم کو نظر آتی ہے' اس پر خاموشی ہی لازم ہے کہ علامہ اقبال کہتے ہیں:

حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست!

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

صہیونیت اور ہندوتوا
ایک ہی سکّے کے دو رُخ

رانا عرفان علی

سورۃ المائدہ کی آیت ۸۲ میں چودہ سو سال قبل ایک ابدی حقیقت بیان کی گئی کہ:

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ﴾

’’تم اہلِ ایمان کا سب سے سخت دشمن یہودیوں اور ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے شرک کیا‘‘

آج کے دور میں اس کی عملی صورت صہیونیت اور ہندوتوا کے تزویراتی (strategic) گٹھ جوڑ کی صورت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ محض ایک سیاسی معاہدہ نہیں بلکہ اس قرآنی تنبیہ کی عملی تفسیر ہے‘ جس کے ڈی این اے میں نسلی برتری اور فسطائیت رچی ہوئی ہے۔ ایک طرف اسرائیل کا ’’نیشن اسٹیٹ لا‘‘ اور بھارت کا ’’سی اے اے‘‘ ایک ہی ذہن کی پیداوار ہیں جو شہریت کو مذہب سے جوڑ کر آبادیاتی تبدیلی (demographic engineering) کے ذریعے مسلمانوں کو بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری جانب فروری ۲۰۲۶ء کا ’’اسپیشل اسٹریٹجک پارٹنرشپ‘‘ معاہدہ اسی نسلی ایجنڈے کو عالمی سطح پر مسلّط کرنے کی کڑی ہے۔ نریندر مودی نے اسرائیل کو ’’فادر لینڈ‘‘ (قوت و حکمتِ عملی کا منبع) اور بھارت کو ’’مدر لینڈ‘‘ (مقدس سرزمین) قرار دے کر اُس نظریاتی و مذہبی ملاپ کا برملا اعتراف کیا ہے جس کا ذکر اللہ ربّ العزت نے صدیوں پہلے کر دیا تھا۔ یہ اتحاد دراصل ’’گریٹر اسرائیل‘‘ اور ’’اکھنڈ بھارت‘‘ کے توسیعی عزائم کو یکجا کر کے اسلام کی نظریاتی اساس اور اس کے دفاعی قلعے پاکستان کے ایٹمی وجود کو نشانہ بنانے کا ایک منظم عالمی منصوبہ ہے۔ دونوں طاقتیں جانتی ہیں کہ جب تک پاکستان کی ایٹمی صلاحیت موجود ہے‘ ان کے ’’مقدس‘‘ توسیع پسندانہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتے۔

ذیل میں صہیونیت (Zionism) اور ہندوتوا (Hindutva) کے درمیان نظریاتی‘

مذہبی اور سیاسی مماثلتوں کا جائزہ لیا گیا ہے‘ جو ثابت کرتی ہیں کہ ان دونوں کے ڈی این اے‘ اہداف اور طریقہ کار یکساں ہیں۔

(۱) مذہبی اور کائناتی تصورات

● **تناسخ (Reincarnation):** دونوں نظریات میں روحوں کی واپسی یا دوبارہ جنم کا تصور موجود ہے۔ یہودیوں کے ہاں ’’گلگول‘‘ اور ہندوؤں کے ہاں ’’آواگون‘‘ یا کرموں کے حساب کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔

● **تخلیقِ کائنات:** دونوں کے ہاں کائنات کی بنیاد ایک مرکزی ہستی سے جڑی ہے۔ صہیونیت میں ابراہام (Abraham) اور ہندوتوا میں برہما (Brahma) کا تصور بنیادی ہے۔

● **مقدس زبان:** دونوں اپنے مذہبی متن اور عبادات کے لیے قدیم اور مخصوص زبانوں (عبرانی اور سنسکرت) کو لازم قرار دیتے ہیں۔

● **باطنی روایات:** دونوں نظاموں میں عملیات، جادو، اور حروف و اشیاء کی تسخیر کے تصورات (قبالہ اور تانترک روایات) گہرے اثرات رکھتے ہیں۔

(۲) سماجی درجہ بندی اور نسلی برتری

● **منتخب قوم کا زعم:** صہیونیت میں یہودیوں کو ’’خدا کی منتخب قوم‘‘ سمجھا جاتا ہے‘ جبکہ ہندوتوا میں براہمن اور اونچی ذات کی برتری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

● **ذات پات کا نظام:** جس طرح ہندومت میں برہمنوں کا خاص درجہ اور دلتوں سے امتیاز برتا جاتا ہے‘ اسی طرح یہودیوں کے ہاں کاہن اور لیوی طبقے کی مخصوص حیثیت اور غیر یہودیوں (Gentiles) سے سماجی دُوری کا تصور ملتا ہے۔

● **تبلیغ سے گریز:** یہ دونوں بنیادی طور پر نسلی مذاہب ہیں جو دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اپنے اندر شامل کرنے یا تبلیغ کرنے پر یقین نہیں رکھتے۔

(۳) مذہبی و ثقافتی علامات

● **مقدس دھاگا:** دونوں میں مقدس دھاگا پہننے کی روایت مشترک ہے۔ یہودیوں میں ’’تزیتزت‘‘ اور سرخ دھاگا (کلائی پر) جبکہ ہندوؤں میں ’’جنئیو‘‘ اور ’’کلاوا‘‘ (سرخ دھاگا) مذہبی علامات ہیں۔

● **جانوروں کی تقدیس:** دونوں کے ہاں مخصوص جانوروں کو روحانی مقام حاصل ہے، جیسے اسرائیل میں سرخ بچھیا (Red Heifer) اور بھارت میں گاؤ ماتا (گائے)۔

● **مقدس رنگ:** صہیونیت میں سرخ بچھیا اور مخصوص نشانات، جبکہ ہندوتوا میں زعفرانی رنگ کو مذہبی بالادستی کی علامت مانا جاتا ہے۔

(۴) سیاسی اور تزویراتی اہداف

● **علاقائی توسیع:** دونوں کے سیاسی اہداف جغرافیائی پھیلاؤ پر مبنی ہیں۔ صہیونیت کا ہدف ''گریٹر اسرائیل'' (نیل سے فرات تک) ہے، جبکہ ہندوتوا کا ہدف اکھنڈ بھارت (پورے برصغیر پر قبضہ) ہے۔

● **مشترکہ دشمن اور ایٹمی پروگرام:** دونوں اسلام اور مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر پاکستان کی ایٹمی طاقت کو اپنے وجود کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں اور اسے ختم کرنے کے مشترکہ ایجنڈے پر کاربند نظر آتے ہیں۔

● **نسل کشی اور جارحیت:** غزہ و فلسطین اور کشمیر و گجرات میں مسلمانوں کے خلاف منظم کارروائیاں، ٹارگٹ کلنگ، اور نسل کشی کے طریقہ کار میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔

● **فاشسٹ آئیڈیالوجی:** دونوں کی بنیادیں جارحانہ قوم پرستی پر ہیں، اور ہندوتوا کے بانیان نازی ازم اور صہیونیت سے متاثر رہے ہیں۔

(۵) مذہبی جنون اور آخری معرکہ

● **مسیحائی انتظار:** دونوں اپنے نجات دہندہ کے منتظر ہیں: یہودی ''مسیح'' کے اور ہندوتوا کے حامی ''کلکی اوتار'' کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

● **ہیکل بمقابلہ مندر:** مسجدِ اقصیٰ کی جگہ تیسرا ہیکل بنانے کا صہیونی عزم اور بابری مسجد جیسی مساجد کو گرا کر وہاں مندر کی تعمیر ایک ہی طرزِ عمل کی عکاسی کرتے ہیں۔

● **وطن سے پوجا کی حد تک وابستگی:** ''ارضِ مقدس'' اور ''پنیا بھومی'' (مٹی کی پوجا) کے تصورات وطن کو ایک الوہی حیثیت دیتے ہیں۔

● **آخری عظیم جنگ:** دونوں ایک آخری فیصلہ کن جنگ (Armageddon یا مہابھارت/دھرم یدھ) پر یقین رکھتے ہیں، جس کے بعد وہ دنیا پر اپنی مکمل سیادت اور رام راجیہ یا صہیونی عالمی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اُمّتِ مسلمہ کے لیے لمحۂ فکریہ

مذکورہ بالا تمام حقائق اور مشاہدات اس بات پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں کہ یہود و ہنود محض دو جغرافیائی خطے یا سیاسی اکائیاں نہیں، بلکہ ایک ہی سکّے کے دو رُخ اور اسلام دشمنی کے عالمی محاذ کے دو متحرک بازو ہیں۔ ان کے نظریات، ان کی تاریخ اور ان کے حالیہ اقدامات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ یہ دونوں گروہ مسلمانوں کو اپنا مشترکہ اور اوّلین دشمن تصوّر کرتے ہیں۔

تاریخ اور حالیہ جغرافیائی بساط پر نظر ڈالیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ یہود و ہنود کا یہ اتحاد دراصل ان دو بڑے معرکوں کی پیش بندی ہے جن کا ذکر احادیثِ مبارکہ میں ملتا ہے، اور اس پورے منظرنامے میں پاکستان کا مقام نہایت منفرد اور روحانی اہمیت کا حامل ہے۔

(ا) غزوۂ ہند اور ''ٹھنڈی ہوا'' کی بشارت

پاکستان محض زمین کا ایک ٹکڑا نہیں بلکہ اس روحانی قوت کا مرکز ہے جس کی نوید چودہ سو سال قبل دی گئی تھی۔ احادیثِ مبارکہ میں مشرق کی سمت سے آنے والی جس ''ٹھنڈی ہوا'' کا ذکر ملتا ہے، اسے علامہ اقبال نے اُمّت کے لیے اُمید کی کرن قرار دیتے ہوئے کہا تھا: ؎

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے!

یہ ٹھنڈی ہوا دراصل اس ایمانی جذبے اور عسکری قوت کی علامت ہے جو غزوۂ ہند میں اسلام کا ہراول دستہ بنے گی۔ احادیث کے مطابق، مشرق سے اٹھنے والا یہ لشکر ہند کے جابر حکمرانوں کو زنجیروں میں جکڑ کر لائے گا اور پھر یہی لشکر شام کی سرزمین پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جا ملے گا۔ یوں پاکستان اس عظیم مہم کے لیے ایک لانچنگ پیڈ کی حیثیت رکھتا ہے، جو مشرق سے مغرب تک حق کی بالادستی کا راستہ ہموار کرے گا۔

(ب) الملحمة الکبریٰ اور عالمی صہیونی محاذ

دوسری طرف، الملحمة الکبریٰ (The Great Slaughter) کا معرکہ ہے جو شام اور مشرقِ وسطیٰ کے میدانوں میں برپا ہوگا۔ یہاں مسلمانوں کا مقابلہ دجالی فتنوں اور ان کے پیروکاروں (جن کی اکثریت یہودیوں پر مشتمل ہوگی) سے ہوگا۔ یہود و ہنود کا حالیہ گٹھ جوڑ دراصل اسی حتمی جنگ کی تیاری ہے جہاں ''گریٹر اسرائیل'' (الملحمة کا فرنٹ) اور ''اکھنڈ

بھارت‘‘ (غزوۂ ہند کا فرنٹ) ایک دوسرے کو سہارا دے رہے ہیں۔

ج) پاکستان: مشترکہ ہدف اور رکاوٹ

یہود و ہنود بخوبی جانتے ہیں کہ پاکستان کی دفاعی قوت بشمول ایٹمی طاقت محض ایک ملک کا دفاع نہیں بلکہ پوری اُمّتِ مُسلمہ کی امانت اور حفاظتی قلعہ ہے۔ یہ قائم رہی تو ان کے توسیع پسندانہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتے۔ ان کے نزدیک مسلم اُمّہ کی تباہی اور مقدسات پر قبضے کی راہ میں سب سے بڑی تزویراتی اور روحانی رکاوٹ پاکستان ہے۔ اسی لیے وہ پاکستان کو معاشی‘ سیاسی اور جغرافیائی طور پر کمزور کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس ٹھنڈی ہوا کے مرکز کو اس طوفان میں بدلنے سے روکا جا سکے جو باطل کے ایوانوں کو تہس نہس کرنے والا ہے۔

وقت کی پکار اور ہماری ذمہ داری

آج اُمّتِ مُسلمہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں خاموشی اور غفلت کی گنجائش ختم ہو چکی ہے۔ یہ وقت ہے کہ:

(۱) مسلمان اپنی ذمہ داری کو پہچانیں: دشمن ہمارے عقائد‘ ہماری نسلوں اور ہمارے دفاعی اثاثوں پر حملہ آور ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ یہ جنگ صرف سرحدوں کی نہیں بلکہ بقا کی جنگ ہے۔

(۲) اتحادِ اُمّت: فرقہ واریت‘ نسلی تعصب اور جغرافیائی قید سے نکل کر ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۪﴾ کے تحت ایک سیسہ پلائی دیوار بُنیانٌ مرصوص بننا آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ جب تک مسلمان تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرے رہیں گے‘ یہود و ہنود کی سازشیں کامیاب ہوتی رہیں گی۔

(۳) نظامِ حق کا قیام: باطل کے ان فاشسٹ نظریات (صہیونیت و ہندوتوا) کا مقابلہ صرف اور صرف ’’نظامِ حق‘‘ کے قیام ہی سے ممکن ہے۔ ایک ایسا نظام جو عدل و انصاف‘ توحید اور انسانیت کی فلاح پر مبنی ہو‘ جو باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُمّت کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔

آخری فتح حق کی ہے، بشرطیکہ ہم اپنے کردار اور عمل سے ثابت کریں کہ ہم اللہ کے دین کے سچے محافظ ہیں۔ پاکستان کی ایٹمی طاقت اور مسلمانوں کا ایمانی جذبہ وہ اثاثہ ہے جو ان تمام عالمی سازشوں کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم اپنے ’’ڈی این اے‘‘ کو ایمانی حرارت سے گرمائیں اور باطل کے اس عالمی گٹھ جوڑ کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ ❁❁

زیرِ اہتمام: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

خَيۡرُكُمۡ مَنۡ تَعَلَّمَ الۡقُرۡآنَ وَعَلَّمَهُ
تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو علومِ قرآن سیکھے اور سکھائے۔

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جامعہ کلیۃ القرآن لاہور (قرآن کالج)

وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے الحاق شدہ

داخلے جاری ہیں

مڈل پاس طلبہ کیلئے
2 سالہ اولیٰ مع میٹرک

درس نظامی (درجہ اولیٰ تا دورۂ حدیث) مع میٹرک،
ایف اے، بی اے، ایم اے

خصوصیات:

- دینی و عصری علوم کا حسین امتزاج
- تجوید پر خاص توجہ
- عربی تحریر و تکلم پر خصوصی توجہ
- باصلاحیت، قابل اور محنتی اساتذہ کی نگرانی
- تربیتی حوالے سے خصوصی پروگرامز
- دینی ماحول میں اعلیٰ تعلیمی معیار
- بہترین قیام و طعام
- رہائشی طلبہ کیلئے فری لانڈری کی سہولت

ضروری کوائف برائے داخلہ:

- اولیٰ و میٹرک کے لیے مڈل پاس سرٹیفکیٹ
- پاسپورٹ سائز کی 4 حالیہ تصاویر
- والد کے شناختی کارڈ کی کاپی
- ’’ب‘‘ فارم / شناختی کارڈ کی کاپی
- داخلے کے لیے سرپرست / والد کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

برائے معلومات:
دفتری اوقات کے دوران: 042-35833637
دفتری اوقات کے بعد: 0302-4471171 / 0301-4882395

191-اے، اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

المعلن: مہتمم: حافظ عاطف وحیدؒ — پرنسپل: مظفر حسین ہاشمیؒ

May 2026
Vol. 75

Regd. CPL No.115
No.5

Monthly **Meesaq** Lahore

PHARMA

Your **Health**
Our **Devotion**

NABIQASIM INDUSTRIES (PVT.) LTD.

Leading Pharmaceutical Manufacturing & Marketing Company, offering wide range of high quality branded generics in all therapeutic categories for domestic and international markets. Specializes in manufacturing complete range of Oral Solid Dosage, Syrups, Freeze Dried Lyophilized Injectables, Laxative Enemas, Effervescent Sachets, Dry Suspensions, Creams. Gels, Ointments, Vaginal Tablets including Hormonal Products, Oral Cephalosporin, Ophthalmic and Otic Drops, Creams and suspensions at its cGMP compliant manufacturing facility at Karachi, Pakistan. The company exports its branded generics to more than **40 countries in Asia, CIS, Middle East, Francophone Africa, Fareast, East & West Africa**

INNOVATION TECHNOLOGY COMPLIANCE

www.nabiqasim.com